جلد ۶۸ ماہ شوال المکرم ۱۳۷۰ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۵۱ء عدد ۱

مضامین

مقالات

ادبیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

از جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی

حالات کے انقلاب نے معارف اور دار المصنفین کی دنیا مین جو تبدیلیان ناگزیر کر دین، اُن کا علم ناظرین کو ہو چکا ہے، ترتیب واقعاتِ کائنات بندہ کے اختیار مین نہین، اور حالاتِ تکوینی خوشگوار ہون یا ناخوشگوار، بہرحال انسان کو اُن کی تخلیق پر قدرت نہین، اس کا کام صرف اس قدر ہے کہ ہر نئے ماحول مین اپنا رویہ اور اپنا عمل و کردار مقتضائے عقل و شریعت کے موافق رکھے، ادارۂ دار المصنفین کے کارکنون اور پرانے خادمون نے اپنی چھوٹی سی دنیا کے اندر اہم اور اچانک اور غیر متوقع صورتِ حال کے پیش آجانے پر جو بہتر سے بہتر فیصلے اپنی فہم و بصیرت کے مطابق کر سکتے تھے، وہ کئے،

معارف کی ادارت ایک مستقل مجلس کے سپرد کر دی گئی، ادارہ کی مجلس انتظامیہ (منیجنگ کمیٹی) کی صدارت کا سہرا صوبۂ بہار کے وزیر ترقیات اور دیرینہ قومی و ملی کارکن آنریبل ڈاکٹر سید محمود کے سر بندھا، یہ وہی عہدہ ہے جس کی زینت کبھی نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی، اور پھر اُن کے صاحبزادہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کی ذات سے رہ چکی ہے، نظامت علمی کیلئے قرعۂ انتخاب بالکل بجا مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی سلمہ کے نام پر پڑا جو معارف کی ادارت ایک مدت سے کرتے چلے آئے ہین، اور ناظم شعبۂ انتظامی کے عہدہ پر مولانا مسعود علی ندوی فائز ہوئے، جو ادارہ کے ابتدائی بانیون مین سے ہین، اور گویا خلق ہی ہوئے ہین انتظامی کاروبار کے لئے، ان صورتون مین حق بحقدار رسید،

صلاحیتون اور اہلیتون کے اس مصرفِ صحیح کے ساتھ نئی بات صرف یہ ایک ہوئی کہ مجلس کارکن (ورکنگ کمیٹی) کی صدارت ایک نااہل کے سر منڈھ دی گئی، یہ منصب وہ ہے جس پر اس سے قبل مفسر القرآن مولانا حمید الدین فراہی جیسے پیکرِ علم و تقویٰ

اور مولانا محمد حبیب الرحمٰن خان شروانی صدر یار جنگ بہادر جیسے ادیب و فاضل جلیل سرفراز رہ چکے ہین، قحط الرجال کی جیتی جاگتی مثال اس سے بڑھ کر اور کیا ملے گی کہ ان ناموروں کی جانشینی اس بے علم و بے عمل کے حصہ مین آئی، مورِ ضعیف تختِ سلیمان پر! اور کبرنا موت الکبراء کی صحیح تفسیر اب جاکر روشن ہو گئی، یہ نیازمند اگر اپنے فرائض تھوڑے بہت بھی ادا کر سکے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ معارف کے ناظرین مین سے صدہا اہل دل اس کے حق مین توفیقِ خیر کی دعائین کرتے رہین،

حسرت موہانی بھی آخر اللہ کو پیارے ہوگئے اور یہ ایک سخت دھکا ہے جو اردو ادب اور قومیت اسلامی دونون کو بیک وقت پہنچا ہے، مرحوم اپنے وقت کے ایک بہترین شاعر تھے، اور غزل گوئی کے تو کہنا چاہئے کہ بادشاہ ہی تھے، شوخی کے ساتھ متانت کا اتنا دلآویز امتزاج کمتر ہی کسی کے حصہ مین آیا ہے، اپنے رنگ مین فرد فرید تھے، کلام عاشقانہ تھا، فاسقانہ نہ تھا، شوخی تھی بے حیائی نہ تھی، رندی تھی، اوباشی نہ تھی، معاملہ بندی تھی، فحاشی نہ تھی، بے تکلفی تھی، رکاکت نہ تھی، سنجیدگی تھی، خشکی نہ تھی، ترکیبون کی صناعت، بندشون کی لطافت، اسلوب کی نزاکت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ، جدت مین اجنبیت نہ تھی، ندرت تھی، طرفگی تھی، اعجوبگی نہ تھی، مومن و نسیم دہلوی کے رنگ کو پہلے اپنایا، پھر پھیلایا، چمکایا، عشق جب جتلایا تو بنتِ عم کے ساتھ، شریف، پردہ نشین خاتون کے ساتھ، آشنائی کا دم، رقیبون کے غول در غول، بازاری بیسواؤن کے ساتھ کبھی نہ بھرا، کلام پڑھیئے تو دل مین سوز و گداز پیدا ہوگا، ولولے بیدار ہونگے، تمنائین انگڑائیان لین گی، جذباتِ نفسانی مین ہیجان ایک بار بھی پیدا نہ ہوگا،

محاورات پر وہ عبور، زبان پر وہ حکمرانی، بلکہ صاحبقرانی کہ باید و شاید، شعر جتنا اچھا کہتے تھے، اتنا ہی اچھا پرکھتے بھی تھے، سخنگوئی اور شے ہے، اور سخن فہمی اور، یہان جو پایہ سخنوری مین تھا، وہی سخن سنجی مین، ع یار ما آن دارد و این نیز ہم، اردوئے معلّٰی کے پرچون کو پڑھ پڑھ کر خدا معلوم کتنون کو خود دعوئ نقادی ہو گیا، آخر زمانہ مین ادھر کئی سال سے سیاست شاعری پر غالب آگئی تھی، پھر بھی سالہا سال کی مشاقی و استادی پر کوئی پانی کیسے پھیر دے!

سیاست مین وہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن، ایک ادارہ، ایک پارٹی تھے، شروع مین اپنے کو منسوب تلک کے اسکول
سے کرتے رہے، اور اب ایک عرصہ سے اپنے کو کمیونسٹ کہنے لگے تھے، لیکن حقیقۃً وہ مقلد کسی کے بھی نہ تھے، مجتہد اگر نہین تو
منفرد تو ضرور تھے، کانگریس مین جب تک رہے ساتھیون ہی سے لڑتے بھڑتے، اور آزادی کامل کا علم بلند کئے رہے،
تحریک خلافت مین رہے تو اسی شیر دلی کے ساتھ، اور مسلم لیگ مین جب کام کیا تو حد یہ ہے کہ قائد اعظم جناح صاحب تک کی شخصیت
سے بھی نہ دبے، مذہبی اتنے کہ کسی میٹنگ، کسی جلسہ مین بھی ہون ادھر نماز کا وقت آیا، اور ادھر وہ اپنی میلی کچیلی سی شیروانی
اتار، اور اُسی کو جانماز بنا، کمرہ مین، برآمدہ مین، صحن مین، جہان بھی جگہ ملی، نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، حج زندگی مین ایک دو تین نہین
غالباً سو کئے، مرید سلسلۂ قادریہ مین فرنگی محل کے خاندان رزاقیہ مین تھے، اور خوش عقیدگی مین حد غلو تک پہنچے ہوئے، اردو دولی
اور لکھنؤ کے عرس تو شاید ہی کبھی ناغہ ہونے پاتے، اتنی گنجان داڑھی اور مذہب کے ساتھ یہ شیفتگی دنیا کے کسی کمیونسٹ مین پائی گئی ہو؟

سیاسی ادبی اور ساری پبلک پہلوؤن سے کہین بڑھ چڑھ کر دلکش، پرتاثیر، قابلِ عظمت، ستودہ صفات، خود حسرت
کی شخصیت اور ذات تھی، سادگی، بے تکلفی، تواضع، انکسار کی ایک تصویر تھے، اپنی بڑائی کا احساس تک نہ تھا، انکی کمیونزم بھی
درویشی کے مرادف تھی، گھر مین غلہ وغیرہ کا ذخیرہ سال بھر کے لئے کیا معنی، مہینہ بھر یا چند روز کے لئے بھی جمع کرنا ناجائز سمجھے
تھے، روز کا روز سودا اپنے ہاتھ سے لاتے تھے، جب دیکھئے دامن مین لئے بازار سے چلے آرہے ہین، نہ کسی سے تکلف نہ کوئی شرم اور
جھجک، راستہ مین بڑے سے بڑے موٹر نشین مل گئے، بے دھڑک اُن سے کھڑے باتین کر رہے ہین، میلی شیروانی، میلی ٹوپی،
بوسیدہ عینک کیساتھ راجہ صاحب سلیم پور کے ہان چلے گئے، فلان راجہ، فلان نواب، فلان گورنر کے ہان چلے گئے، اور جو کچھ کہنا
تھا، لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ سن آئے، کوئی مہمان آگیا، تو کچھ پروا نہین، رات کی باسی کھچڑی چھینکے پر ٹنگی ہوئی تھی، وہی لیکر
خود بھی کھائی، اسکو بھی کھلادی، بڑا تکلف و اہتمام کیا، تو جاکر دو پیسے کا دہی لے آئے، ہر حال مین خوش، ہر حال مین مست
اور مگن اتنے لیڈرون مین اُنہی کو دیکھا، بے صبری اور ناشکری کا لفظ جیسے اُن کے کان مین کبھی پڑا ہی نہ تھا، جو کچھ بھی مل گیا
ہنسی خوشی کھالیا، اور کچھ نہ ملا تو فاقہ بھی اُسی خوش دلی اور بشاشت قلب کے ساتھ کاٹ دیا، نفسِ مطمئنہ کتابون مین پڑھا
تھا کہ بعض بزرگون کو حاصل ہو جاتا ہے، آنکھون سے مثال اسی درویش کی زندگی مین دیکھی،

مقالات

اصحاب الاخدود

از

جناب مولانا ابو الجلال صاحب ندوی

جب بھی دنیا مین کوئی اصلاحی تحریک اٹھی اکثر ایسا ہوا کہ رسم قدیم کے عشاق نے اصلاح پسندون کے لئے
زمین اُس کی وسعتون کے باوجود تنگ کردی، چنانچہ ابتدا مین اسلام کو بھی اس قسم کی دشوارین سے سابقہ
پڑا، اور اہلِ مکہ نے تعذیب مسلمین کو انتہائی حدود تک پہنچا دیا تھا، خدا نے سورۂ بروج مین فرمایا،

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ وَالْيَوْمِ
الْمَوْعُودِ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ
قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ
الْوَقُوْدِ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ وَّهُمْ
عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ
وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا
بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ الَّذِيْ لَهٗ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

گواہی دے گا آسمان جس کے اندر بروج ہین،
اور وہ دن جس کا اٹل وعدہ ہے، اور تماشائی
اور خود تماشا یہ خبر دے گا کہ) مارے پڑے ہون
کنڈ والے (یعنی) ایندھن بھری آگ (والے)
جب کہ وہ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اور
وہ اہلِ ایمان کے برخلاف اپنے کرتوت کا
تماشا دیکھتے تھے، ان بیچارون کا قصور تھا
تو بس یہ کہ وہ اس اللہ پر ایمان رکھتے تھے،

وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْد،	جو عزیز ہے، ستودہ ہے، آسمانون اور زمین کا مالک وہی ہے، اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے،

اس کے بعد خدا نے ظالمون کو عذابِ جہنم اور عذابِ حریق کی دھمکی اور مظلومون کو جنت کی بشارت دی، توبہ کرنے والون کو مغفرت کی امید دلائی، پھر فرعون و ثمود کے انجام کی طرف اشارہ فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا:-

بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ تَکْذِیْبٍ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِھِمْ مُّحِیْطٌ بَلْ ھُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ، (بروج)	مگر جو کافر ہین وہ تکذیب مین مبتلا ہین حالانکہ اللہ ان کو ہر طرف سے گھیرے ہو ہے، یہ تو ایک ایسا بزرگ قرآن ہے جو ایک محفوظ لوح مین لکھا ہوا ہے،

لفظ اخدود | "الاخدود" کا لفظ "خد" سے مشتق ہے جس کا مطلب زمین مین لمبا شگاف ڈالنا ہے، زمین کے لمبے شگاف کو خواہ وہ قدرتی ہو، خواہ انسانون کا کھودا ہوا اسے اخدود کہتے تھے، چونکہ بطور بدل قرآن مین اس لفظ کے بعد آگ کا ذکر ہے، اس لئے الاخدود سے مراد اس جگہ آتشی خندق ہے، جسے ہندی مین اگنی کنڈ کہتے ہین:

اصحاب الاخدود | اب سوال یہ ہے کہ اس سورہ کے اندر کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے یا اس قسم کے ہر واقعہ کا یہ آیتین ذکر کرتی ہین، ابوحیان نے اپنی تفسیر مین لکھا ہے کہ

"اصحاب الاخدود کے بارے مین مفسرین نے دس اقوال نقل کئے ہین، ہر قول ایک طویل قصہ ہے، جن کو اس کتاب مین نقل کرنے سے ہم نے کسلمندی برتی ،

اسی طرح امام رازی اور صاحب روح المعانی نے بھی لکھا ہے کہ اصحاب اخدود کی بابت دس سے

زائد اقوال ہین، روح المعانی مین ہے کہ عصام الدین نے کہا کہ شاید یہ تمام واقعات مراد ہون، اور تمام روایتین سچی ہون،

ہمارے خیال مین "اصحاب الاخدود" کا نام لے کر خدا نے کسی معین قوم کا ذکر نہین کیا ہے، بلکہ آیت کا مصداق ہر وہ واقعہ ہے، جس پر یہ آیت صادق آجائے، خواہ وہ نزول قرآن سے پیشتر گذرا ہو، یا بعد مین،

تعذیب بالنار | ایام قدیم مین بعض جرائم کی سزا آدمی کو اگنی کنڈ مین ڈال دینا تھا، چنانچہ حضرت ابراہیم کی قوم نے بت شکنی کی پاداش مین اُن کے خلاف یہ فیصلہ کیا تھا،

قالوا ابنوا لہ بنیانا فالقوہ فی الجحیم (صافات ۳)	اس کے لئے ایک عمارت بناؤ، اور اُسے آگ مین جھونک دو،

اسی طرح اور بھی واقعات اس قسم کے ہوئے، کفار و مشرکین نے بارہا اہل توحید کو آگ مین جھونکا اگر حضرت ابراہیم کے قصہ مین صرف آگ کا ذکر ہوتا، اور اُن کی بت شکنی کا تذکرہ نہ ہوتا، تو اصحاب الاخدود کو قوم ابراہیم سے بھی تطبیق دی جاسکتی تھی، لیکن اُن کے قصہ مین اور اصحاب الاخدود کے قصہ مین دو باتون کا فرق ہے،

۱- اصحاب الاخدود نے مومنون کو آتشین خندق مین جھونکا تھا، اور قوم ابراہیم نے ایک عمارت بنائی تھی،

۲- اصحاب الاخدود کے مظلومون کا جرم صرف ایمان باللہ تھا، اور قوم ابراہیم نے صرف ایمان باللہ کی بناپر نہین، بلکہ بت شکنی کی پاداش مین یہ سزا تجویز کی تھی:

حضرت ابراہیم کا قصہ اصحاب الاخدود کے قصہ کے مطابق نہین ہے، پھر بھی وہ ایک نظیر ہے، جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مشرکین عہد ابراہیم سے بعض مذہبی جرائم کی سزا و تعذیب بالنار تجویز کرتے تھے، تعذیب بالنار کا رواج اس وقت سے ظہور اسلام کے وقت تک برقرار رہا، حضرت رسول خدا کی ولادت سے کچھ پیشتر عراق پر ایرانیون کے ماتحت عمرو بن ہند حکومت کرتا تھا، اس کو المحرق کہا جاتا تھا، کیونکہ اُس نے کئی

آدمیون کو آگ مین جلا دیا تھا، اگرچہ اس کا ذکر بھی زیرِ تفسیر آیت کی نوعیت نہین رکھتا، کیونکہ اُس نے کسی
کو ایمان باللہ کی پاداش مین نہین جلایا تھا، بلکہ اس کا ذکر ہم نے صرف یہ دکھانے کے لئے کیا ہے کہ تعذیب
بالنار کا رواج ظہورِ اسلام کے عہد تک برقرار رہا، خود قریش بھی اس قسم کی سزا دیتے تھے، چنانچہ حضرت عمار بن
یاسرؓ کو وہ جرمِ توحید کی سزا مین طرح طرح کی اذیتین دیتے تھے، ٹھیک دوپہر کے وقت تپتی ہوئی ریگ پر
لٹاتے، اور دہکتے ہوئے انگارون سے داغتے، اور گھنٹون پانی مین غوطے دیتے، چنانچہ بعض مفسرین کی
رائے مین اصحاب الاخدود سے مراد قریش ہی ہین، ابو حیان نے لکھا ہے کہ ایک قول کے مطابق "ھم"
سے مراد قریش ہین، جو مومن مردون اور مومن عورتون کو دکھ پہنچاتے تھے، مگر یہ تفسیر نادر ہے، اور جمہور اسکو
نہین مانتے، کیونکہ یہ ثابت نہین ہے کہ قریش نے خندق کھود کر اور اس خندق مین الاؤ جلا کر کسی کو جھونکا ہو،
اور جن اصحاب الاخدود کا قرآن مین ذکر ہے، انھون نے خندق کھودی، اس مین آگ جلائی، مومنون کو اس
آگ مین ڈالا، اور اُس کے گرد بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہے، اگر "قتل" کے متبادر معنی لئے جائین، تو عین اس وقت
جب وہ تماشا دیکھتے تھے، ایسا حادثہ پیش آیا کہ وہ خود مارے پڑے بشرطیکہ اصحاب الاخدود سے ظالم مراد
ہون جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے، مظلوم مراد نہون، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بعضون نے "قتل"
کی تفسیر اصحاب الاخدود کو ظالمون سے تطبیق دے کر "لعن" کے لفظ سے کی ہے، اس لئے قرآنی قصۂ اصحاب الاخدود
کی ایسے ہی واقعہ سے تطبیق دی جاسکتی ہے، جو کم از کم چارون مذکورہ خصوصیات کا جامع ہے،

اخدود بابل | ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ انھون نے فرمایا، ھُو
ناس من بنی اسرائیل ..... وزعموا انه دانیال واصحابہ،

اس روایت کو جس سند سے ابن جریر نے نقل کیا ہے، اُس کی نوعیت قابلِ استدلال نہین، لیکن
اس مین حضرت دانیالؑ کا ذکر آگیا ہے، حضرت دانیال کا قصہ قرآنی قصۂ اصحاب الاخدود سے ملتا جلتا
ہے، بائبل مین ایک کتاب بنام سفرِ دانیال، اس کے تیسرے باب کا خلاصہ یہ ہے کہ

"بخت نصر نے سونے کی ایک مورت بنوائی، اور صوبہ بابل مین ایک جگہ اسے نصب کیا، اُس نے
تمام رعایا کو بلوا کر حکم دیا کہ لوگ اس مورت کو سجدہ کرین، اس حکم کی سب نے تعمیل کی، مگر
حضرت دانیال اور اُن کے ساتھیون نے اس حکم کی تعمیل نہ کی، تب کسدیون نے یہودیون پر نالش
کی، بخت نصر بہت برہم ہوا، اُس نے یہودیون کے رہبرون حضرت دانیال وغیرہ کو بلا کر حکم دیا
کہ اوندھے منہ گرو، اور سجدہ کرو ورنہ آگ کی جلتی بھٹی کے اندر ڈال دیئے جاؤگے، اور تمھارا خدا
تمھین میرے غضب سے نہین بچا سکے گا، ان لوگون نے کہا ہمارا خدا جس کی ہم بندگی کرتے ہین،
وہ ہم کو آگ کی جلتی بھٹی سے بچانے کی قدرت رکھتا ہے، یہ جواب سُن کر بادشاہ نے حکم دیا، اور
یہ لوگ جلتی بھٹی مین ڈالے گئے، لیکن آگ نے اُن کو گزند نہین پہنچایا، بلکہ جو لوگ اُن کو بھٹی مین
ڈالنے گئے، آگ کے شعلون نے ایک کرانی کو جلا دیا، یہ دیکھ کر بادشاہ سراسیمہ ہوگیا، خود
بھٹی کے منہ پر آکر نظر کی، تو دیکھا کہ آگ مین تین ملزمون کے علاوہ ایک چوتھا بھی ہے، اور چوتھے
کی صورت خدا کے بیٹے کی سی ہے، اور ان مین سے کسی کو آگ نے نہین جلایا، تب بخت نصر نے
خدائے اسرائیل کی ستائش کی، اور ان بہادرون کی اس بات پر تعریف کی کہ انھون نے خدا
کے حکم پر توکل کر کے بادشاہ کے حکم کو ٹال دیا، اور فرمان نافذ کیا کہ

مین حکم دیتا ہون کہ جو قوم یا گروہ یا اہل لغت سدرک اور مسک اور عبید نجو کے خداوند
کے برخلاف نالائق سخن بولین گے، اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائین گے، اور ان کے گھر کھود کر
پھینک دیئے جائین گے، کیونکہ کوئی دوسرا خدا نہین، جو اس طرح چھڑائے"

اس واقعہ پر اصحاب الاخدود کے قصہ کی پانچون خصوصیات منطبق ہوتی ہین، لیکن اس کے باوجود
مفسرین کی اکثریت نے اس تطبیق پر اعتماد نہین کیا ہے، ہمارے خیال مین قرآن پاک کا اشارہ اس واقعہ
کی طرف بھی ہے، مگر صرف اسی کی طرف نہین ہے بلکہ اور واقعات بھی قرآن کے مشار الیہ ہین، مثلاً بابل کم

جن کی فہمایش کے لئے یہ آیتین نازل ہوئین، اس واقعہ سے قطعًا ناواقف تھے، تقریبًا اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے نصف صدی پیشتر نجران مین ظہور پذیر ہوا تھا، عام طور پر مفسرین نے اسی پر قرآنی قصۂ اصحاب الاخدود کو منطبق کیا ہے،

اخدود نجران اس قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ یمن مین ایک بادشاہ تھا ذونواس، اس کا زمانہ از روے حساب ۵۲۵ء (525) قرار دیا جا سکتا ہے، اس کے زمانہ مین نجران مین عیسائیت پھیلنے لگی، نجران کے نصرانیون کے امام ایک بزرگ عبد اللہ بن الثامر تھے، ذونواس نے یہودی مذہب اختیار کر رکھا تھا، اُس نے اہلِ نجران کو یہودیت کی طرف دعوت دی، انھون نے اس کی دعوت قبول نہ کی، تب اُس نے اُن کے قتل کا فیصلہ کیا،

(ازرقی ج ۱ ص ۱۳۷)

فصنّف لهم القتل فمنهم من — پھر اس نے لوگون کو طرح طرح سے مارا،

قتل صبراً ومنهم من اوقد له — کسی کو باندھ کر قتل کیا گیا اور کسی کو آگ

النار في الاخدود فالقى في النار — کی خندق کھود کر اس مین جھونک دیا،

یہ روایت بہت طویل ہے، ہم نے مختصرًا نقل کی ہے، ازرقی کی کتاب مین چونکہ پوری سند ہے اس لئے الفاظ ہم نے ازرقی سے لئے ہین، یہ ایک مشہور واقعہ ہے، لیکن کیا اسے سورۂ بروج کے اصحاب الاخدود سے کوئی تعلق ہے؟ اس سوال کا جواب صاف ہے، ذونواس موحد تھا، نصرانی عمومًا مشرک ہوتے ہین، لیکن عبد اللہ بن ثامر موحد تھے، ذونواس نے جس لئے بھی اہلِ نجران کو قتل کیا ہو، لیکن اس واقعہ پر قرآن کا یہ بیان چسپان نہین ہوتا کہ ظالمون نے ایمان باللہ کی پاداش مین اہلِ ایمان کو آگ مین جھونکا، اور اُن کی نظر مین مظلومون کی خطا صرف یہ تھی کہ وہ موحد تھے، ذونواس خود موحد تھا، اس لئے اُس نے نصرانیون کو جرمِ توحید کی سزا نہین دی ہوگی،

ازرقی نے اس قصہ کی سند مین محمد بن اسحاق کا نام لیا ہے، جن کو بعض اہلِ مکہ نے بواسطہ سعید بن جبیر وعکرمہ حضرت ابن عباسؓ کی زبان سے یہ قصہ سنایا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ تفسیر قرآن مین اس قصہ

کو نجران کے نصرانیون نے مسلمانون کے بھولے پن سے لکھوا دیا، ابن مردویہ نے عبد اللہ بن نجی سے تخریج کی ہے کہ

"مین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے پاس بیٹھا تھا، اتنے مین نجران کا اسقف آگیا، حضرت علیؓ نے اس سے اصحاب الاخدود کا حال پوچھا، وہ جب پورا قصہ بیان کر چکا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اس ماجرا کو تم سے زیادہ مین جانتا ہون" (روح المعانی ج ۹ ص ۳۰۴)

اس کے بعد حضرت علیؓ نے ایک دوسرا ہی قصہ سنایا، اس قدر روایت سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ قصۂ ذونواس کا سرچشمہ اسقف نجران کا بیان ہے، اس نے نجرانیون کے دین کو دینِ حق ثابت کرنے کے لئے یہ بات کہی تھی، اہلِ نجران کی مسیحیت جیسی تھی، اس کا اندازہ سورۂ آل عمران کی ابتدائی آیتون سے ہوتا ہے، ایک عبد اللہ بن ثامر کو توحید ماننا ضروری ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ کے عہد مین اُن کی قبر سے ایک ایسا کتبہ برآمد ہوا، جو ان کا موحد ہونا ثابت کرتا ہے، لیکن عام اہلِ نجران موحد نہ تھے، اس لئے اُن پر اصحاب الاخدود کا قصہ چسپان نہین ہوگا،

حدیثِ صہیب اصحاب الاخدود کی بابت ایک قصہ حضرت صہیب رومیؓ سے مروی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ نے ایک ذہین لڑکے کو ایک کاہن یا ساحر کے سپرد کیا، کہ اسے اپنا علم سکھا دو، لیکن اس لڑکے کی ملاقات ایک راہب سے ہوگئی، جس سے اُس نے دینِ صحیح حاصل کیا، اس لئے بادشاہ نے اس لڑکے کو مار ڈالنے کی بار بار طرح طرح سے کوشش کی، لیکن ہر بار ناکام رہا، بالآخر خود لڑکے کی فرمایش پر بسم اللہ رب ہذا الغلام کہکر لڑکے کو تیر مارا، وہ شہید ہوگیا، اس کے بعد لوگ جوق جوق اس کے دین مین داخل ہونے لگے، بادشاہ نے لوگون کو حکم دیا کہ اس نئے دین سے باز آؤ، نہین تو ہون کنڈ مین جلا دیئے جاؤ گے، مگر بہتون نے جلنا پسند کیا، اور اپنے دینِ صحیح سے لوٹنا پسند نہ کیا، حضرت صہیب یہ قصہ بیان فرما کر سورۂ بروج کی آیت سنایا کرتے تھے۔

اس قصہ کی روایت ثابت بنانی نے عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ سے اور انھون نے حضرت صہیبؓ سے کی ہے، ثابت بنانی سے یہ قصہ دو شخصون کو معلوم ہوا، ایک حماد بن سلمہ کو، دوسرے معمر کو، اول الذکر بزرگ کی روایت مسند احمد، صحیح مسلم اور سنن نسائی مین وارد ہے، ان روایتون مین یہ قصہ مرفوع ہے، لیکن معمر کی روایت امام ترمذی نے

نقل کی ہے، ان کے بیان کے مطابق حضرت صہیبؓ نے مرفوعاً جو بات بیان کی تھی، وہ یہ نہین بلکہ ایک اور بات

تھی جس کی تخریج امام احمدؒ نے سلیمان بن المغیرہ عن ثابت کے طریق سے کی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک نبی کے ذریعہ خدا

نے ایک قوم کو اختیار دیا تھا کہ یا تو میرے انتقام کو پسند کر لو یا دشمن کے تسلط کو، انھون نے خدا کے عذاب کو پسند

کیا تو اللہ نے ان پر موت مسلط کر دی، یہ حدیث بیان کرنے کے بعد جبر کی حدیث کے مطابق عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ

نے کہا،

وکان اذا حدث بهذا الحديث ... جب وہ یہ حدیث بیان کرتے تو اس کے

حدث بهذا الحديث الآخر، ... ساتھ یہ دوسری حدیث بھی بیان کرتے۔

ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر مین اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ

"اس سیاق مین اس بات کی صراحت نہین ہے کہ یہ قصہ کلام نبی مین سے ہے، ہمارے شیخ

ابو الحجاج المزی نے کہا ہو سکتا ہے کہ یہ صہیب رومی کا کلام ہو، کیونکہ وہ اخبار نصاریٰ کے

عالم تھے"،

ابو الحجاج المزی کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ حضرت صہیبؓ رومی، حضرت رسول خدا صلی اللہ

علیہ وسلم کا فرمایا ہوا قصہ نقل کر کے یہ قصہ اس لئے بیان کیا کرتے تھے تاکہ ان لوگون کی دانشمندی کا اندازہ

ہو جنھون نے اپنے جیسے انسانون کی بے رحمی پر خدائے رحیم کے انتقام کو ترجیح دی کیونکہ مومن اصحاب الاخدود

کو بے گناہی کے باوجود آدم زادون نے وہ سزا دی جس کا سننا تک دردمندون کے حق مین عذاب ہے اور

خدائے رحیم نے گنہگارون کو صرف یہ سزا دی کہ وہ مر گئے، اور مرنا تو ایک دن سب کو ہی ہے،

امام ترمذی کی حدیث کے خاتمہ پر یہ بھی ہے کہ اس لڑکے کو پھر دفن کیا گیا، کہتے ہین کہ پھر اس کی لاش

حضرت عمرؓ کے زمانہ مین برآمد ہوئی تھی، اور قتل کے وقت جس طرح اس کی انگلی اُس کی کنپٹی پر تھی، اسی طرح

اس وقت بھی تھی،

چونکہ یہ بات حماد بن سلمہ کی روایت مین نہین ہے، اس لئے یہ قول غالباً معمر کا ہے، ابن اسحاق کا بیان ہے

کہ مجھے عبد اللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم نے بتایا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ مین نجران کے ایک کھنڈر کو ایک شخص نے

کھودا، تو عبد اللہ بن تامر کی لاش کھل پڑی، جسے بحالت نشست دفن کیا گیا تھا، وہ اپنے ہاتھ کو سر کے زخم پر رکھے

ہوئے تھے، جب ہاتھ ہٹایا جاتا، تو خون بہنے لگتا، اور جب زخم پر رکھ دیا جاتا، تو خون تھم جاتا، اس کے ہاتھ مین ایک

انگشتری تھی جس پر کندہ تھا، ربی اللہ حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی گئی، تو آپ نے حکم دیا کہ جون کی تون لاش

کو دفن کر دیا جائے، (ابن کثیر)

اخدود شام | روایت کے اس سیاق مین حدیث ترمذی کی بہ نسبت زیادہ حیرتناکی موجود ہے، بہرحال

اس روایت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حدیث ترمذی کا آخری فقرہ جس کا بھی ہو اس کے خیال مین حضرت صہیب نجران

ہی والے قصہ کو بیان کرتے تھے اور قصۂ نجران جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہین سورہ بروج کی آیت کا مصداق نہین ہو سکتا، اس

غالباً حضرت صہیبؓ رومی نے جو قصہ بیان کیا ہے اس کا تعلق روم یا شام کے نصرانیون کی تاریخ سے ہے،

صفوان بن عبد الرحمان بن جبیر سدی، اور مقاتل سے روایت ہے کہ اخادید تین تھے،

ا۔ اخدود یمن یا اخدود نجران (۲) اخدود بخت نصر جس کا مقام صفوان نے عراق کو اور مقاتل نے

فارس کو بتایا (۳) اخدود روم یا اخدود شام،

اس اخدود کی بابت صفوان بن عبد الرحمن بن جبیر کی رائے ہے کہ یہ قسطنطین کے زمانہ کا واقعہ ہے جب کہ

گمراہ نصاریٰ موحد نصاریٰ پر نہایت شدید مظالم کرتے تھے، مقاتل کا قول ابن کثیرؒ نے ان الفاظ مین نقل کیا ہے کہ

اما التی بالشام فهو انطانیوس ... شام والے اخدود کا نام انطانوس

الرومی، ... رومی تھا،

لیکن معالم التنزیل مین انطیاخوس کا نام چھپا ہے، ہمارے خیال مین یہی لفظ درست ہے، شام پر

سنہ ۲۸۰ ق م سے لیکر سنہ ۶۵ ق م تک ۲۱۵ برس ۱۳ اشخاص نے حکومت کی جو سب Arsacides کہلاتے تھے،

ان میں سب سے زیادہ ظلم یہود پر انطیاخوس اپیفانس (سنہ ۱۶۴ ق م) نے کئے، حضرت صہیب رومیؓ نے جس واقعہ کا ذکر کیا، مقاتل نے اسی کا یا کسی اور واقعہ کا جو قرآنی قصہ اخدود کے مطابق تھا، مقام اور زمانہ ان الفاظ میں بتایا ہے، لیکن صفوان نے اسے نصرانی تاریخ کا واقعہ سمجھا، غالباً اُن کے پیش نظر حضرت صہیبؓ کی روایت تھی، جس میں راہب کے لفظ کی موجودگی اسے نصرانیوں ہی کا واقعہ بتاتی ہے،

بخت نصر (سنہ ۶۰۰ ق م) انطوفیوس (سنہ ۵۰۰ ق م) قسطنطین (سنہ ۳۰۰ء) اور ذو نواس (سنہ ۵۰۰ء) کے زمانوں کے واقعات میں سے ہر ایک کی طرف عہد تابعین میں کسی نہ کسی کا خیال منعطف ہوا کہ قرآنی قصہ اخدود میں اسی واقعہ کا تذکرہ ہے، لیکن قرآن کریم کے عہد نزول میں سورہ بروج کی آیتیں سن کر مکہ کے لوگوں نے جس واقعہ کا خیال کیا، وہ اُن میں سے ایک بھی نہیں تھا،

اخدود حبش

معالم التنزیل میں ہے کہ ابن جبیر نے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے کہ اصحاب الاخدود کے نبی ایک حبشی قروک تھے، نواب صدیق حسن خان نے فتح البیان میں ابن المنذر اور ابن ابی حاتم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اصحاب الاخدود اہل حبش ہیں، تفسیر روح المعانی میں ابن مردویہ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ عبداللہ بن نجی نے کہا کہ نجران کے اسقف نے حضرت علیؓ کو اصحاب الاخدود کا قصہ سنایا، تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم سے زیادہ اس کا علم مجھے ہے، اور اخدود حبش کا قصہ سنایا، اس قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے اہل حبش کے درمیان ایک نبی کو مبعوث فرمایا، یہ نبی ان پیغمبروں میں سے تھے، جن کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ

ومنھم من لم نقصص علیك — ان میں سے چند کے قصے ہم نے نہیں سنائے،

ان پیغمبر سے ان کی قوم نے کئی بار جنگ کی، آخری جنگ میں یہ پیغمبر گرفتار ہو گئے، پھر قوم نے اُن کے تمام پیروؤں کو آگ کی بھٹی میں یکے بعد دیگرے جلا دیا، سب سے آخر میں ایک عورت لائی گئی، جس کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا، بچے کی ممتا نے اس کے استقلال میں لغزش پیدا کر دی، مگر ننھا بچہ بول اُٹھا کہ اماں استقلال سے کام لیجئے، اور شبہہ سے دور رہئے، چنانچہ اس نے بھی اور اہل ایمان کی طرح جل مرنا پسند کیا،

افسوس یہ ہے کہ ہمارے سامنے اس روایت کی سند موجود نہیں ہے لیکن بات اتنی دل کو لگتی ہے کہ اسی کو ترجیح دینے کا خیال بار بار ذہن میں پیدا ہوتا ہے، مگر اس سے بھی زیادہ جو روایت مجھے پسند آتی ہے، وہ ابن ابی الدنیا کی روایت ہے، جسے ابن کثیر نے پوری سند کے ساتھ لکھا ہے کہ حضرت جعفر طیارؓ کے پوتے ابراہیم بن محمد عبداللہ نے کہا کہ ان کو بعض اہل علم نے خبر دی کہ حضرت ابو موسیٰؓ نے جب اصفہان کو فتح کیا تو وہاں کی دیواروں میں سے ایک دیوار کو گری ہوئی پایا، اس کو بار بار بنوایا، ہر بار گر پڑی، تب اُن سے کسی نے کہا کہ اُس کے نیچے ایک مرد صالح کی قبر ہے، دیوار کی بنیادیں کھود دی گئیں، تو اس میں ایک بیٹھی ہوئی لاش اور ایک تلوار ملی جس پر مکتوب تھا کہ

انا الحارث بن مضاض نقمت علی اصحاب الاخدود، — میں ہوں حارث بن مضاض میں نے اصحاب الاخدود سے انتقام لیا،

ابن کثیر نے اس روایت پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ یہ حارث بن مضاض ابن بنو جرہم کا آخری بادشاہ تھا جن کو ثابت بن اسماعیل کے بعد تولیت کعبہ ملی، اس لئے اس خبر کا اقتضا یہ ہے کہ اس کا زمانہ حضرت اسماعیلؑ سے تقریباً ۵۰۰ برس بعد ہو، اور ابن اسحاق کی خبر یعنی قصہ نجران کا اقتضا یہ ہے کہ وہ زمانہ فترت (بعد عیسیٰ قبل محمد علیہما الصلوٰۃ والسلام) ہو، اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے،

ابن کثیر کے علم و فضل کی تعظیم و تقدیس کے ساتھ ساتھ یہ کہنا ضروری ہے کہ خود ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ حارث اس زمانہ کا آدمی ہے جب خزاعہ نے بنو جرہم کو یمن کی طرف جلاوطن کر دیا تھا، خزاعہ کی بابت مروی ہے کہ قصی سے پہلے ۳۰۰ برس تک کعبہ ان کا قبضہ رہا، اور قصی کو بہرام گور کا معاصر بتایا گیا ہے، اسلئے حارث بن مضاض کا زمانہ سنہ ۲۰۰ ق م یا اس سے کچھ قبل ثابت ہوتا ہے، بنو جرہم کی بابت جو یہ مروی ہے کہ وہ ثابت بن اسماعیل کے بعد خانہ کعبہ کے متولی ہوئے، اس کا ٹھیک مطلب یہ ہے کہ "ثابت" کہلانے والی قوم کے فنا ہو جانے کے بعد ان کو تولیت کعبہ حاصل ہوئی،

بہرحال یہ روایت یہ ثابت کرتی ہے کہ حارث بن مضاض نے جس کی قبر اگرچہ اصفہان میں ملی لیکن تھا وہ
مکہ کا بادشاہ خواہ دو سنہ قم کے قریب ہوا اس سے پہلے اس نے اصحاب الاخدود نام ایک قوم سے ان کے
مظالم کا انتقام لیا تھا جن اصحاب الاخدود سے اس کی نے انتقام لیا تھا اہلِ مکہ نے قرآن میں یہ لفظ سن کر
اس سے یقیناً انہی کا خیال کیا ہوگا، میرے نزدیک اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ سورہ بروج میں اصحاب الاخدود
سے کوئی معین قوم مراد نہیں ہے لیکن قرآن کے اندر مذکورہ قصہ کا نمایاں ترین مصداق وہی واقعہ ہے جسے
اہلِ مکہ جانتے تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جانب جو روایت منسوب ہے، اگر اس کا انتساب صحیح ہے تو
قطعی طور پر وہ اصحاب الاخدود جن سے حارث بن مضاض نے انتقام لیا تھا، اہلِ حبش ہی ہو سکتے ہیں،

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن کے نزول سے پیشتر اکثر اہل ملل اپنے دین سے برگشتہ ہو جانے والے کو یہ سزا
دیتے تھے کہ اُن کو آگ کی کنڈ میں ڈال کر بھسم کر دیتے تھے، حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے حضرت رسولِ خدا
صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے ۵۰ برس پہلے تک اس قسم کے متعدد واقعات ہوئے، چنانچہ سنہ ۶۰۰ ق م کے قریب
بابل میں حضرت دانیال کے ساتھیوں کو آگ میں ڈالا گیا، سنہ ۔۔ ق م کے قریب انطیاخوس نے کچھ یہود
کو جلایا، سنہ ۱۴۰ ق م کے قریب حارث بن مضاض کے زمانہ میں ایک اصحاب الاخدود نے کچھ مومنوں کو نذر
آتش کیا، غالباً یہ اہلِ حبش تھے، جنھوں نے ایک نبی اور اس کے ماننے والوں کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا،
سنہ ۳۲۰ء کے قریب تثلیث پرست نصرانیوں نے موحد نصرانیوں کی سوختنی قربانی اپنے غضب کے دیوتا
پر چڑھائی، سنہ ۵۲۰ء کے قریب ذونواس یہودی نے نصرانی عبد اللہ بن تامر اور اُن کے ساتھیوں کو آتشی
خندق میں جھونکا، سنہ ۶۱۵ء کے قریب قریش نے حضرت عمار بن یاسر کو آگ سے داغا، ظہورِ اسلام کے بعد
بھی یورپ میں ایک زمانہ آیا، جب نصرانی کلیسا ہر مذہبی مجرم کو طرح طرح کی سزا دیتا تھا، جس میں تعذیب
بالنار بھی ہے، ان واقعات میں سے جن پر بھی قرآنی قصہ اصحاب الاخدود کا چسپاں ہو جائے
ان کو قرآن کا مشار الیہ قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ قرآن کا مقصد اصحاب الاخدود کے تذکرہ سے

یہی ہے کہ لوگ یہ سمجھ رکھیں کہ جن لوگوں سے بھی مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ستانے دکھ دینے اور اُن کی
تعذیب کا جرم سرزد ہوگا، اُن کے لئے عذاب حریق اور عذاب جہنم ہے، قیامت کے دن کوئی عذر معذور کام
نہ دیگا، آج تو لوگ تکذیب کرتے ہیں، لیکن اس دن آسمان گواہی دیگا، وہ دن خود واقعات گذشتہ کی ہو بہو
تصویر پیش کر دے گا، تماشا دیکھنے والے گواہی دیں گے، اور جن کے جلنے کا تماشا دکھایا گیا، وہ گواہی دیں گے،
پھر خدا کو بذاتِ خود بھی سارا ماجرا پہلے سے معلوم ہوگا، جو کچھ ہوا، ہوتا ہے، اور ہوگا، سب کچھ ایک لوح
محفوظ میں مکتوب ہے، غرض کہ ظالم کے خلاف ہر وہ ثبوت موجود ہوگا جس سے کوئی انکار نہ کر سکے گا، اسلئے
لوگوں کو تعذیب اہلِ ایمان سے بچنا چاہیئے،

گجرات کا بحری بیڑہ

از

ازجناب مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورنیکلر سوسائٹی

"یہ ایک طویل مقالہ کا ایک باب ہے جو بمبئی یونیورسٹی ہال مین پڑھا گیا تھا، اس کو فاضل مقالہ نگار کے شکریہ کے ساتھ معارف مین شائع کیا جاتا ہے"

گجرات کی جغرافی حیثیت

ہندوستان کے جنوب مغرب کا ملک قدرتی طور پر کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اس حصہ کو بحیرۂ عرب گھیرے ہوے ہے اس کے سامنے عمان ہے، اس کے داہنے خلیج فارس، اور اس کے بائین خلیج عدن ہے، عدن یمن کی پرانی بندرگاہ ہے، حضرموت گجرات کے سامنے واقع ہے، اور بحرین خلیج فارس کا بحری مرکز ہے، اسلئے ان طبعی سہولتون کے سبب سے گجرات کا عرب کے ساتھ میل جول ایک قدرتی بات ہے پھر کچھ دن سے سندھ کا راستہ بھی کھلا تھا، اور سمندر سے بھی دیول (سندھ کی پرانی بندرگاہ) جاتے تھے اسی طرح دکھن کا راستہ بھی بری اور بحری دونون طرف سے تھا، مشرق کا راستہ مثلاً مارواڑ، مالوہ، خاندیس وغیرہ البتہ صرف خشکی کا تھا جہان تجارت کاروان کے ذریعہ ہوتی تھی، الغرض گجرات شمال اور جنوب کے مغربی جانب کے وسط مین واقع ہونے اور اس کے ایک طرف سمندر اور دوسری طرف خشکی کے باعث اس کی جغرافی حیثیت بہت اچھی تھی، اور اسی لئے یورپ، مصر، عرب، شام، عراق وایران کے جہازون کی آمد ورفت بہت تھی، لنکا، مدراس، بنگال، آسام، برما، اور چین جانے والے جہازون کو گجرات کسی نہ کسی بندرگاہ پر ٹھہرنا ہی پڑتا تھا، اور یہی گجرات کی ثروت اور خوشحالی کا سبب تھا،

گجرات کی قدیم بندرگاہین

گجرات کی قدیم بندرگاہین کون کون تھین، ان کا صحیح صحیح حال معلوم کرنا بہت مشکل ہو کیونکہ ہندوستان کی قدیم تاریخ تاریکی مین ہے لیکن اسلامی عہد کی ابتدا مین جو بندرگاہین تھین، ان کو درج کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ رومی اور یونانی تاریخون سے بھی جن بندرگاہون کا پتہ چلا ہے، ان کو بھی اس مین شامل کردیا ہے، دوارکا، سومناتھ، کچھ، کھنبایت، ولبھی پور (گوگھ) دھولیرا، (دھندھوکا) بھروچ، آرورکھ، گندھار، اچھے مور، اسوپارہ، تھانہ، بعض لوگون نے مندرجہ ذیل نام کا اضافہ کیا ہے، نوساری، بلی مورا، کیتم، پوربندر، مانگرول، ہاتھب[1]، سوربہ پور، گندیوی، گوپ ناتھ، مہوہ،

اسلامی عہد کی بندرگاہین

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ گجرات کا ملک عرب کے بالمقابل واقع ہے، ایران، عراق، شام، مصر اور افریقہ کے ساحل سے گجرات کی بندرگاہون پر بکثرت جہاز آتے تھے، اور چونکہ اس عہد مین عربون کا عروج تھا، اور وہ چین تک تجارتی مال لے کر جاتے تھے، اس لئے کچھ تو تجارتی مال کی خرید و فروخت، اور کچھ سامان رسد اور میٹھے پانی کے لئے اُن کو گجراتی بندرگاہون پر ٹھہرنا ہی پڑتا تھا،

پھر جب گجرات بھی اسلامی حکومت کے ماتحت ہوگیا، اور خود مختار گجراتی بادشاہون نے اپنے ملک کو ترقی دینے کی کوشش کی، تو گجرات اور کاٹھیاواڑ مین بہت سی بندرگاہین کھل گئین، چنانچہ مرآۃ سکندری اور مرآۃ احمدی، اور ظفر الوالہ مین بہ تشریح لکھا ہے، کہ سلاطین گجرات کے عہد مین اس ملک مین چوراسی بندرگاہین تھین[2]، ان چوراسی بندرگاہون کے نام مجھے دستیاب نہ ہوسکے لیکن تلاش سے جس قدر بھی مل سکے حسب ذیل ہین

گجرات تین حصون[3] مین منقسم ہے، خاص گجرات، کاٹھیاوار (سورٹھ) اور کچھ، چنانچہ کچھ کی بندرگاہین یہ تھین، لکھپت، مانڈوی، مدرا، جکھو، کنڈلا، ٹونا، اور کاٹھیاوار کی بندرگاہین مندرجہ ذیل تھین

---

[1] گجرات نو وہان وٹو، ص ۲ گجراتی [2] ظفر الوالہ ص ۲۳۳، جلد اول [3] میرے رفیق کار ڈاکٹر چھوٹو بھائی نائک ام اے جو میرے ساتھ ریسرچ ورک مین کام کرتے تھے، ان کا مین شکر گذار ہون ان ان مین سے بعض نام جغرافیہ (گجراتی) سے نکال کر مجھے دئے،

نولکھی (موربی) جوڈیا، بیڈی (جام نگر) سلایا، اوکھا (دوارکا) پوربندر، نوی بندر، مادھوپور منگرول، چورواڑ، ویراول، سومناتھ، کوڈی نار، دیو، جعفرآباد، مہووا، بھاونگر، دھولیرا، ولبھی پور، (گھوگھ) نوانگر متصل دیو گھانف (متصل دھندھوکا) جھون جھون واڑا اور گجرات کے متعلق حسب ذیل بندرگاہیں تھیں،

کھمبایت، بیرم، بھروچ، بھاڑبھوت، گندھار، انکلیشور، ہانسوٹ، سورت، راندیر، ڈومس نوساری، گندیوی، دل ساڑ، دمن، ٹنکاریہ، دے ایج، دہے گاؤن، کاودی، سنجان، بلی مور (متصل گندیوی) بے مور (متصل بمبئی) ماہم، تھانہ، سوپارہ، بسی، کلیان، ڈہانو،

یہ بندرگاہیں تین قسم کی تھیں، اول درجہ کی وہ بندرگاہیں تھیں، جن میں بڑے سے بڑی اور بھاری سے بھاری جہاز آجاتے تھے، جیسے گھوگھ، دیو، بھروچ ویراول، یا سومناتھ وغیرہ،

دوسری درجہ کی بندرگاہیں وہ تھیں جن میں متوسط درجہ کے جہاز آجاسکتے تھے، اور تیسرے درجہ کی بندرگاہیں زیادہ تر کچی تھیں، جہاں چھوٹے چھوٹے جہاز، کشتیاں، ڈونگی، بوڑی وغیرہ جاتی تھیں ان کو بنگال بہار وغیرہ میں عموماً گھاٹ کہا جاتا ہے، ان کچی بندرگاہوں پر کبھی کبھی بڑے بڑے جہاز بھی سمندر میں مد کے وقت آکر ٹھہر جاتے، مال اُتارتے، اور پھر مال بھر کر جب مد کا انتظار کرتے، تو جزر کے وقت یہ جہاز جہاں مقیم ہوتے، کج ہو جاتے، کیونکہ پانی اتر جانے کے باعث جہاز اپنے وزن کے سبب زمین پر پہنچ جاتا، راقم الحروف کو رنگون (برما) مانڈلے وغیرہ میں بارہا اس کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے،

موجودہ بندرگاہیں

برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان پر مکمل قبضہ کرنیکے بعد تمام بندرگاہیں بند کر دیں اور پورے ہندوستان کیلئے صرف چار بندرگاہیں قائم کیں، کراچی (سندھ) بمبئی (گجرات) مدراس، کلکتہ (بنگال) لیکن اُن راجاؤں اور نوابوں کی ریاستوں میں جو ساحل سمندر پر تھیں، مثلاً پوربندر، منگلور، (کھمبائت) کچھ وغیرہ، ان میں چند شرطوں کے ساتھ بندر پر آمدورفت کی اجازت دے دی، مگر ان شرائط کے سبب سے یہ بندرگاہیں فوائد عامہ کے کام کے لئے نہیں صرف اپنی ریاستوں کے لئے تھیں، ابھی تقریباً تیس چالیس برس سے انہی شرطوں پر کاٹھیاواڑ

اور گجرات میں متعدد بندرگاہیں کھل گئیں، اور کروڑوں روپیہ ان پر صرف کیا گیا، جو مندرجہ ذیل ہیں،

اوکھا منڈل (بڑودہ) پوربندر، مانگرول، ویراول، سومناتھ، کوڈی نار (بڑودہ) جعفرآباد، بھاونگر، نوانگر (جام نگر) مانڈوی (کچھ) کھمبایت، باقی بندرگاہیں جن پر آمدورفت ہے، وہ زیادہ تر کچی ہیں، اور گورنمنٹ کی اُن پر کڑی نگرانی رہتی ہے کہ وہ بمبئی کے پورٹ کمشنر کے مقررہ کردہ محصول کو ادا کئے بغیر مال نہ اتارنے پائیں،

بحر عرب میں قدیم زمانہ کی جہازرانی

عرب کے ساحلی علاقہ کے لوگ ہمیشہ سے جہازران رہے ہیں، اور تاریخی زمانہ سے قبل بھی وہ جہازرانی کرتے تھے، گو اُن کی پوری تفصیل نہیں معلوم، عرب تاجر جن کو پہلے کنعانی اور بعد میں آرامی کہتے تھے، اور اب فنیقی کہا جاتا ہے، جہازوں کے ذریعہ تجارت کرنے میں بڑے ماہر تھے، دراصل یہ بحرین کے رہنے والے تھے، جو شام میں جاکر آباد ہوگئے تھے، صور اور صیدا، دو شہر ان کے بڑے مرکز تھے، وہ بحر روم کے کنارے کنارے یونان پہنچے، اور وہاں سے یورپ چلے جاتے، اسی طرح مشرق میں بحرین اور بحر احمر کے ذریعہ ایران، اور ہندوستان کے ساحلی علاقوں کو طے کرکے چین تک اپنا مال لیجاتے، اور پھر وہاں کی چیزیں یورپ پہنچاتے، اور اسی طرح مشرق اور مغرب دونوں طرف کی تجارت پر قابض تھے، یہ ۱۰۰۰ ق م کا واقعہ ہے،[1]

بارہویں صدی ہجری میں جہاز بڑے بڑے ہوتے تھے، ایک معمولی جہاز نوے (۹۰) گز طویل بیس گز عریض اور بیس ہی گز بلند ہوتا تھا، اس کے تین مستول ہوتے تھے، ہر مستول پر دس دس بادبان اور سو گز لمبی ناریل کی رسی ہوتی تھی، آہنی لنگر تیس من کا ہوتا، اور ایک لاکھ من وزن بار کرتا تھا، لیکن اگر مسافر جہاز ہوتا، تو نصف وزن تجارتی مال کا اور نصف مسافروں کے مال و اسباب اور جنگی سامان کا ہوتا، یہ قاعدہ تھا کہ جہاز جس قدر لمبا ہوتا، اس کا چوتھائی حصہ ارتفاع اور اسی قدر چوڑائی ہوتی تھی،[2]

۱۰۴۷ء (۴۳۹ھ) میں حکیم ناصر خسرو نے لکھا ہے کہ المعز باللہ فاطمی کی کشتیاں دو سو فٹ طویل اور

---

[1] ارض القرآن جلد اول [2] مجالس رنگین ص ۵۹ لکھنؤ،

اسی فٹ عریض تھیں یعنی ایک سو گز لمبی اور بیس گز چوڑی ہوتی تھیں، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہو کہ اس زمانہ کے لحاظ سے یہ کشتیاں کتنی بڑی ہوتی تھیں، ان بڑے جہازوں مین متعدد درجے ہوتے تھے پہلا درجہ سب سے نیچے صرف سامان کے لئے ہوتا تھا، تاکہ بوجھ سے وزن قائم رہے، دوسرا اور تیسرا درجہ مسافرون کے لئے ہوتا تھا، اور چوتھا جو بہت مختصر اور سب سے بلندی پر ہوتا تھا، اس مین افسر اعلیٰ کپتان (ناخدا) رہتا، معمولی افسرون اور خلاصیون کے رہنے کی جگہ علاحدہ ہوتی تھی، اسلحہ اور محافظ سپاہیون کا الگ مقام ہوتا تھا، آٹھوین صدی ہجری مین ایسے جہاز بھی بنتے تھے جن مین سوار پلٹن آسانی سے سما سکتی تھی، انکے پچھلے حصے کھلے ہوتے تھے، جو غالباً اصطبل ہوتا تھا، اس مین گھوڑے سوار کردیے جاتے تھے، اور جب کسی بندر پر اترنا ہوتا، تو سپاہی مسلح ہوکر پھر سوار ہوجاتے، اور اسی حالت مین جہاز بندر پر اُترتے تھے، اور اگر دشمن سامنے ہوتا تو فوراً حملہ آور ہوجاتے،[1]

جنگی جہازون کی ساخت مین ذرا فرق ہوتا تھا، اس کے اوپر کی سطح پر توپین رکھی جاتی تھین، توپین چلتے وقت چونکہ دھکہ دیتی ہین، اس لئے اُس کے پیچھے روک کے لئے دیوار ہوتی تھی، جو دھاکون کے زور سے بھی ان کو بچاتی تھی، جنگی جہازون مین سپاہیون کی بارکین ہوتی تھین، اسلحہ خانہ بھی ہوتا تھا، مسافر جہازمین حجرون (کمرون) کے علاوہ، باورچی خانہ، غسلخانہ، بیت الخلاء الگ الگ ہوتا تھا، کھانے کے سامان کا گودام بھی علٰحدہ ہوتا تھا، چینی ملاح تورونی کی گرمی کے ذریعہ مرغیون کے انڈے سے بچہ بھی پیدا کرتے تھے، اور خلاصی بیج بوکر ترکاری بھی پیدا کرتے تھے، میٹھے پانی کا خزانہ الگ ہوتا، اور اس کی تقسیم حساب سے ہوتی تھی، کیونکہ اس زمانہ مین یہ پانی کسی بندر یا جزیرہ سے حاصل کیا جاتا تھا، جو محدود مقدار مین ہوتا تھا، کھارے پانی سے نمک الگ کرکے میٹھا پانی بنانے کا رواج نہ تھا،

جہاز ساگون کی لکڑی سے تیار کئے جاتے تھے، جو زیادہ تر مالابار اور ملبار سے آتی تھی،[2] یہ لکڑی مضبوطی

---

[1] سفرنامۂ ابن بطوطہ جلد دوم باب و [2] مقدمہ مرآۃ احمدی ص ۱۵، کلکتہ،

کے لحاظ سے بہترین ہوتی ہے، پانی اس پر بہت کم اثر کرتا ہے، اور کیڑے بھی کم لگتے ہین، اس لکڑی کے متعلق ہندوستان مین مشہور مثل ہے کہ سو برس گرا، سو برس پڑا، سو برس کھڑا یعنی تین سو برس تک خراب نہین ہوتی،

بحر عرب اور بحر ہند کے جہاز ناریل کی رسیون سے سی کر بناتے تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ ان سمندرون مین مقناطیس کے پہاڑ ہوتے ہین، جو میلون سے جہاز کے لوہے، پتیل، ٹین وغیرہ کو کھینچ لیتے تھے، اور کیلون کے نکل جانے کے بعد جہاز شکستہ ہوکر غرق ہوجاتا تھا، برخلاف بحر روم کے کہ وہان مقناطیسی اثر نہ ہونے کے سبب سے جہاز سلامت رہتا تھا،

۲۰۰۰ ق م مین یمن کی ایک قوم سبا نے بھی اس تجارت مین کافی حصہ لیا، جنوبی ہندوستان سے اُن کے تعلقات بڑے وسیع تھے، یہ ہندوستان سے چمڑا، زین پوست، جادتری، ہڑ، بہیڑا، آبنوس، کچھوے کی ہڈی، کباب چینی، مخمل، رانگا، لوبان، بید، مقبر، ہاتھی دانت، مختلف نباتات کے تارون کا کپڑا، ہلدی، لونگ، الائچی، سیاہ مرچ، دار چینی، ڈلی، ناریل، آملی، خصوصیت سے لیجاکر غیر ممالک مین فروخت کرتے، چنانچہ بعض چیزون کے عربی کے وہ نام جو ہندی سے آئے ہوئے ہین، وہ اس کی شہادت دیتے ہین، مثلاً مشک، فلفل، کافور، زنجبیل، صندل، نارجیل، قرنفل، جائفل وغیرہ،[1]

بعض نامون کے ساتھ لفظ ہندی لگانے سے اس کا ثبوت ملتا ہے، جیسے عود ہندی، قسط ہندی، تمر ہندی وغیرہ،

لوہے کے سامانون مین خالص فولاد کی تلوار ہندوستان ہی سے جاتی تھی، اس لئے عربی مین ہندی اور مہند تلوار کے وصف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے،[2] اس کے علاوہ اور چیزین بھی بہ تاجر ہندوستان سے باہر لیجاتے تھے، چنانچہ مؤرخ جوزیفس نے لکھا ہے کہ سوپارہ (بمبئی) اور بھروچ (بھروچ) سے حضرت سلیمانؑ کے عہد مین (۹۵۰ ق م) ہاتھی کے دانت، بندر، مور، وغیرہ کی فلسطین مین تجارت ہوتی تھی،

---

[1] تمدن ہند مطبوعہ آگرہ [2] فتوح البلدان بلاذری ذکر سندھ، مصر،

کپڑون کی تجارت بھی ان عربون کا محبوب مشغلہ تھا، ہندوستانی کپڑون مین ململ چھینٹ اور رومال خصوصیت سے قابلِ ذکر ہین، جن کو عربی مین قرفس (کرپاس، کپاس) شیت (چھینٹ) اور فوطہ کہتے ہین، بھڑوچ سے نیل، مل اور لاکھ بھی باہر جاتی تھی،

غرض عرب تاجر بڑے بڑے جہازون کے ذریعہ گجرات سے زیادہ مال لیجاتے، کیونکہ وہ قریب ترین ملک تھا، یونانی حملون سے پہلے سنسکرت وغیرہ مین جو لفظ یون کا آتا ہے، اس سے دراصل یہی "ین" مراد ہے، لیکن سکندر کے حملوں کے بعد یونانیون کی کثرت آمد و رفت کے باعث پھر یہ لفظ یونانیون کے لئے بولا جانے لگا، اسکی مثال دوسری زبانون (مثلاً برما وغیرہ) مین بھی موجود ہے،

جہازون کی بناوٹ اور ساخت

بحرِ عرب اور بحرِ روم کے جہازون کی بناوٹ مین بڑا فرق تھا، بحرِ روم کے جو جہاز بنتے تھے، اس کے تختے کیلون کے ذریعہ جڑے جاتے تھے، اور اُن کے سرے مختلف قسم کے جانورون کے مثلاً اونٹ، مینڈھے، اور کوے کی طرح کے ہوتے تھے، اور دونون سرے نوکدار ہوتے تھے، راقم الحروف نے رنگون اور مانڈلے مین جو شاہی کشتیان دیکھین، اُن کے سرے اژدہے کے مثل تھے، اس کے برخلاف بحرِ عرب کے ہندی جہازون مین کیلون کے بجائے رسیون سے کس کر دو تختون کو ملاتے تھے، اور پانی کے نفوذ کو روکنے کے لئے چربی سے اس کو بند کرتے، اور تختون پر ملتے[3]، اور گجراتی جہاز مسطح بنائے جاتے تھے، ان کے دونون سرے گاودُم ضرور ہوتے تھے، مگر نوکدار اور بلند نہ ہوتے تھے، نوکدار جہاز موج کے وقت ایک طرف کو بہت بلند ہو جاتا ہے، اور دوسری طرف بہت پست جس سے جہاز مین ہر وقت پانی آجانے کا خوف رہتا ہے، اور گجراتی مسطح جہازون مین بلندی اور پستی دونون مین تقریباً یکسانیت ہوتی تھی، اسی لئے کشمیر کے سلطان زین العابدین نے ڈل مین جب محل تیار کرایا، تو اس کی زمین بھرنے کے لئے اس نے

۱؎ معجم البلدان یاقوت حموی ۲؎ سفرنامہ سلیمان بصری ص ۸۸ پیرس و ظفر الوالہ جلد اول ص ۵ ۳؎ و سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم ص ۱۳۱ دہلی،

گجراتی کشتیان استعمال کین، ان مین مٹی بھر کر ترتیب سے غرق کر کے زمین پیدا کی پھر اس پر عمارت کھڑی کی، یہ مسطح کشتیان اس کام کے لئے بےحد موزون تھین[1]، گجرات کے ساحلی لوگ بھی ہمیشہ سے جہازی بیوپار کرتے آئے ہین، لیکن کسی تاریخ سے میرے علم مین یہ بات نہین آئی کہ وہ مغرب کی طرف ہندوستان سے باہر اپنے جہاز لے گئے ہون، گو وہ جہاز بنانے مین بڑے ماہر تھے،

بندرگاہون کا نظام

گجراتی بندرگاہون کا کیا نظام تھا، اس کا مفصل حال تو معلوم نہ ہو سکا، لیکن بعض جزئیات کا ذکر تاریخون مین ملتا ہے، مثلاً ان راجاؤن کے عہد مین محکمۂ بحریہ ہوتا تھا، اور اس کا مخصوص وزیر ہوتا، چنانچہ سدھ راج (۵۳۸ھ / ۱۱۴۳ء) ہو لنگی عہد مین بہارل نامی ایک وزیر اسی عہدہ پر تھا، جو پٹن سے کھنبایت ہر ماہ آتا تھا[2]، بندرگاہون پر ایک افسر بھی ہوتا جس کی اجازت سے جہاز بندرگاہ مین لنگر انداز ہوتا تھا، جیسا کہ سنجان مین پارسیون کے جہاز کے متعلق روایت مشہور ہے، تجارتی جہازون کے لئے تو اس افسر کی اجازت کافی ہوتی تھی، لیکن اگر ایسا مسافر جہاز ہو جس مین ایسے لوگ ہون جو اس ملک مین رہنا چاہتے ہون تو اس کی اجازت راجہ سے لینی پڑتی تھی، ایک محکمہ محصول لینے کا بھی تھا، جو تاجرون کے مال کی جانچ کر کے محصول لیتا تھا، اس محکمہ کی طرف سے درآمد اور برآمد دونون پر نگرانی رہتی بڑی بندرگاہون سے، جیسے کھنبایت اور بھروچ سے بڑی آمدنی ہوتی تھی، چنانچہ ہونگ تسانگ چینی سیاح نے لکھا ہے کہ بھروچ پر اس کی دولت و ثروت کے سبب آس پاس کے راجاؤن کی نظر رہتی ہے،

اسلامی عہد مین محکمۂ بحریہ کے متعلق مسافرون کے بیان سے بہت کچھ معلومات حاصل ہوتے ہین، خلجی اور تغلق کے عہد مین تو کوئی نمایان ترقی نظر نہین آتی، لیکن سلاطین گجرات کے زمانہ مین اس کو بےحد ترقی ہوئی، سمندری علاقہ جس کے سپرد ہوتا تھا اس کو امیر البحر کہتے تھے، اس کا درجہ وزیر بحر کے برابر تھا، اور اس کا تعلق براہ راست بادشاہ سے ہوتا تھا،

۱؎ واقعات کشمیر قلمی کتبخانہ حبیب گنج ۲؎ موسم بہار جلد سوم مطبوعہ بمبئی بیان ولاۃ ہند،

احمد شاہ اول کے عہد (۸۴۴ھ ۱۴۴۰ء) میں مخلص الملک امیر البحر تھا، اور میرا خیال ہے کہ ابتدا میں شاہ بندر اور امیر البحر دونوں عہدے ایک ہی شخص کے پاس ہوتے تھے، جو بندرگاہ کا بھی انتظام کرتا تھا، اور جہازی بیڑہ بھی اسی کے ماتحت ہوتا، سلطان قطب الدین کے زمانہ (۸۶۱ھ ۱۴۵۶ء) تک خواجہ علاء الدین شاہ بندر تھے، ۸۶۲ھ ۱۴۵۷ء میں دیو کا شاہ بندر ناخدا اسماعیل نائب تھا، ۸۷۶ھ ۱۴۷۲ء میں سلطان محمود اعظم کے عہد میں فرحت الملک امیر طوغان امیر البحر ہوا[1]، سلطان مظفر کے زمانہ ۹۲۶ھ ۱۵۱۹ء تا ۹۲۸ھ ۱۵۲۱ء تک ملک ایاز رہا، پھر ۹۲۸ھ میں اس کا لڑکا اسحاق ہوا، لیکن بہادر شاہ کے ابتدائی عہد میں اس کو سورٹھ کا حاکم بنا دیا گیا، اور محمود آقا کو امیر البحر پھر قوام الملک کو شاہ بندر (حاکم دیو) بنایا[2]، ۹۳۶ھ ۱۵۳۰ء میں ملک طوغان بن ایاز کو امیر البحر بنایا، اس کے بعد مصطفیٰ بہرام رومی خان شاہ بندر اور امیر البحر ہوا، دیو، سورت، راندیر، بھاؤنہ، دمن سب اس کے ماتحت تھے، اس کے بعد خداوند خان صفر سلیمانی امیر البحر ہوا، اور اس کی شہادت کے بعد رجب خداوند خان مقرر ہوا، ۹۴۶ھ میں امیر شیخ برہان الملک نبانی امیر البحر تھے[3]، اور ۹۵۵ھ میں ناصر حبش خان دیو کا شاہ بندر تھا، اس کے بعد دیو، دمن پر پرتگیزوں کا قبضہ ہو گیا، بھروچ و سورت کھنبایت چند بندرگاہیں رہ گئیں جن پر مراد قابض ہو گئے، مغلیہ عہد میں زیادہ تر خشکی پر توجہ رہی، سمندر کا خیال کم تر رہتا، اور اسی لئے اس زمانہ میں جہازی بیڑہ بڑا کمزور تھا، مسافر اور تجارتی جہاز، برآمد سرکاری بہت کم ہوتے، زیادہ تر شخصی ہوتے، مسافروں اور مال کا کرایہ مالک جہاز لیتا، لیکن درآمد کا محصول، پاسپورٹ (راہداری) وغیرہ کا کام شاہ بندر سے متعلق ہوتا، دشمنوں کی مدافعت بھی شاہ بندر کے فرائض میں داخل تھی، اور اسی لئے پرتگیز جب بھروچ میں گھس آئے اور شاہ بندر علی خان کو اس کی خبر نہ ہوئی تو سلطان محمود نے اس کو معزول کر دیا[4]، انگریزوں کے ابتدائی عہد اور تیموریوں کے آخری وقت میں سورت اور بھروچ کے تین انتظامی حکام ہوتے تھے، شاہ بندر، قلعہ دار، حاکم شہر، اور ان ہی تینوں

[1] مراۃ سکندری ص ۲۱۰ [2] ایضاً ص ۲۱۲ [3] ظفر الوالہ اول ص ۲۷۷ [4] ایضاً

کی خانہ جنگی سے اکثر بندر انگریزوں کے قبضہ میں چلے گئے، سلطان محمود ثالث کے عہد میں مندرجہ ذیل بحری افسر تھے، آقا فرخ شاہ، فتح خان قرا حسین، جہانگیر خان، مصطفیٰ قرمانی، عادل خان قرمانی، رجب خداوند خان، الغ خان سلطانی، ناصر دریا خان، اسمٰعیل چرکس، اسد خان، فرو خان سلطانی، ان میں سے خداوند خان شاہ بندر اور جہانگیر خان افسر توپ خانہ اور مصطفیٰ قرمانی گولہ انداز تھا، باقی کیا تھے معلوم نہیں،

تجارتی جہاز جب آتے تو کپتان اس کے مال کی فہرست شاہ بندر کے پاس بھیجتا، اگر وہ مناسب سمجھتا تو سلطان کو خبر دیتا، اور بادشاہ اپنی پسند کا مال خرید لیتا، باقی تاجروں کو فروخت کرنے کی اجازت دیدیتا، جب تک شاہ بندر جہاز کو ہر سامان سے مکمل نہ پاتا اس وقت تک اس کو آنے اور جانے کی اجازت نہ دیتا، مسافروں کے لئے پروانہ راہداری ضروری تھا، شاہ بندر کی اجازت کے بغیر نہ کوئی جہاز بندرگاہ سے جا سکتا اور نہ آ سکتا تھا، یہ محکمہ تین حصوں میں منقسم تھے، ایک تجارتی، دوسرا مسافر، اور تیسرا جنگی،

مسافر جہازوں میں صرف ضروری سامان اور مال صرف اسی قدر ہوتا تھا جس قدر سمندر میں وزن قائم رکھنے کے لئے ضروری ہوتا، جنگی جہاز تو اصل میں امیر البحر کے سپرد ہوتا تھا لیکن نہر پر قیام، مرمت صفائی، سامان رسد کی بہم رسانی وغیرہ کے لئے شاہ بندر (پورٹ کمشنر) کی اجازت ضروری ہوتی، مراۃ احمدی کے خاتمہ میں محکموں کی فہرست دی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بندرگاہ کے ملازمین کی کل تعداد دو سو تک ہونی چاہیئے،

گجراتیوں کی جہازرانی گجرات اور کاٹھیاواڑ کے ساحلی باشندے آج بھی دریائی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں، اس سے یقین ہوتا ہے کہ ان کو سمندری تجارت اور جہازرانی سے خاص واقفیت تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ سندھ سے لے کر لنکا تک ان کے جہازوں کی آمد و رفت رہتی تھی، اور بہ نسبت تامل (ٹمیل) لوگوں کے گجرات کا بیڑا لنکا زیادہ آمد و رفت کرتا تھا، اور یہ بھی کہا جاتا ہے، کہ وہ جاوا، سماٹرا تک جاتا تھا، پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی تک شترپ خاندان کی حکومت جیسی خشکی میں تھی، ویسی ہی سمندر میں بھی

تھی، ان دنون تجارت کو بڑا فروغ تھا، چھٹی صدی مین سیلون اور سوپارہ مین تجارتی تعلقات بہت وسیع تھے، اسی صدی مین ہُن لوگون نے تھر اور جات کو کچھ سے نکال دیا، اور وہ لوگ بحرین مین جاکر آباد ہوئے، ہیونگ تسانگ چینی سیاح نے لکھا ہے کہ ایران کے شہرون مین اوس نے ہندوؤن کو آباد دیکھا ہے، یہ جاٹ ان جہازون مین معلم کا کام کرتے تھے، جو ایران اور گجرات کے درمیان آمد و رفت رکھتے تھے۔[۱]

نوین صدی مین گجراتی اس قدر طاقتور ہو گئے تھے کہ جاوا مین برسر حکومت ہو گئے، اسی لئے وہان کا تمدن چینی ہمسایون کے تمدن کے مقابلہ مین ہندو تمدن سے زیادہ قریب تھا، چنانچہ وہان کے راجہ کو نرراج کہتے تھے، عرب مسافرون نے بھی اپنے سفرنامہ مین اس امتیاز کو تحریر کیا ہے، اور غالباً اسی سبب سے جاوہ کا سکہ گجرات مین چلتا تھا، جس کو طاطریہ کہتے تھے، جیسا کہ عرب سیاحون نے لکھا ہے، گپت کے سکے بھی مدغاسکر (افریقہ) اور جاوہ مین چلتے تھے، اور جاوہ کی زبان مدغاسکر کے تاجر سمجھتے تھے،[۲] عرب کے مسافرون کا بیان ہے کہ بصرہ اور سیراف مین ہندو آتے ہین، مگر آپس مین بھی ساتھ مل کر نہین کھاتے، حالانکہ اُن کی تعداد سو سے زیادہ بھی ہوتی ہے،[۳] بزرگ بن شہریار نے بھی اپنی کتاب مین بنیون کا بار بار ذکر کیا ہے، جو تیسری صدی ہجری کا مسافر ہے،[۴] یمن بھی یہ لوگ جاتے تھے، اور کافی تجارتی فائدہ اٹھاتے، چنانچہ گجرات کا ایک بنیا "دینا یک" نامی یمن مین تجارتی سلسلہ رکھتا تھا، اور خود بھی یمن جاتا تھا،[۵]

مندرجۂ بالا بیانات سے یہ تو قطعی ثابت ہو گیا کہ گجراتی تاجر عرب، مصر، عراق، ایران، لنکا اور جاوا سے تجارت کرتے تھے، اور ان تمام مقامات مین جہازون کی آمد و رفت تھی، بھیم دیو دوم (۱۲۴۲ء) کے پاس بحری بیڑہ تھا، اور ارجن دیو (۱۲۷۵ء) کا امیر البحر ایک مسلمان تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربون نے اس محکمہ کو بہت منظم بنا دیا تھا، جیسا کہ راشٹر کی فوجون کو مرتب کر دیا تھا،

---

[۱] بمبئی گزیٹیر جلد ... ص ۴۹۳ [۲] گجرات نو وہان وٹو (گجراتی) [۳] سفرنامہ ابوزید سیرافی ص ۱۴۶ پیرس [۴] عجائب الہند ص ۱۹۵ لندن [۵] موسم بہار جلد سوم بیان داؤد بن عجب شاہ بمبئی،

بحری مرکز

تاریخی زمانہ کے قبل کی ہندوستان کی جہازرانی تاریکی مین ہے، تاہم جزئی واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ گجرات کے شمال مین ۲۰۰۰ سنہ قبل مسیح "دوارکا" بحری مرکز تھا اور جنوب مین بھروچ، اور ۹۵۰ ق سنہ مین (رور کھ) بھروچ مرکز نظر آتا ہے۔

پہلی صدی عیسوی سے کھنبایت کو ترقی شروع ہوئی، وبھی راج یعنی چھٹی صدی مین گھوگھا کو مرکزی درجہ حاصل تھا، لیکن تجارت کی منڈی کھنبایت ہی رہی، اور جنوب مین بھروچ اپنی جگہ پر رہا، ساتوین صدی مین بھی بھروچ اور کھنبایت اپنی جگہ پر بحری مرکز رہے، جیسا کہ چینی سیاح ہیونگ تسانگ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، آٹھوین صدی عیسوی مین بھی گو بھروچ اور کھنبایت کی مرکزیت قائم رہی مگر تھانہ (متصل بمبئی)، اور سوپارہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی، کیونکہ وہ راشٹر کوٹ راجاؤن کی راجدھانی "مان کھیٹر" سے قریب تر جگہ تھی، عرب سیاحون نے اس کا ذکر بڑی تفصیل اور خصوصیت سے کیا ہے، اسی طرح چوڑا خاندان کے پایہ تخت پٹن سے کھنبایت نزدیک تھا، اس لئے نوین صدی عیسوی سے بھروچ کی حیثیت گر گئی، اور کھنبایت بحری مرکز بن گیا، سولنکی راجاؤن کے عہد اور باگھیلا خاندان کے آخر عہد (سنہ ۱۳۰۴ء) تک کھنبایت بحری مرکز رہا، خلجی اور تغلق کے زمانہ مین بھی کھنبایت اپنے اصلی حال پر رہا، سلاطین گجرات مین سے محمود شاہ اول تک کھنبایت اگرچہ بحری مرکز تھا لیکن دیو ترقی کرنے لگا، سلطان مظفر دوم اور سلطان بہادر شاہ تک دیو بحری مرکز رہا، اور تجارتی حیثیت سے بھی اس کو کافی ترقی ہوئی، لیکن محمود بن لطیف ان کے زمانہ مین جب دیو پر فرنگی (پرتگیز) قابض ہو گئے تو کھنبایت کو پھر بحری مرکز بنایا، بڑے جہاز گھوگھا مین ٹھہرتے، اور وہان سے کشتیون مین کھنبایت لاکر مال اتارتے، مظفر شاہ آخری سلطان کے عہد مین امیرون کی خانہ جنگی سے مرکزی حکومت جاتی رہی، بھروچ، سورت، اور کھنبایت مین علحدہ علحدہ مرکز ہو گئے، مغلیہ سلطنت مین کھنبایت اور سورت کی مرکزی حیثیت قائم رہی اور بھروچ گر گیا، عالمگیر کے زمانہ مین (سنہ ۱۶۰۰ء) سورت کو بڑی ترقی ہوئی، اور کھنبایت کو زوال آگیا، شاہ عالم کے عہد مین مومن خان ثانی

کھنبایت کا شاہ بندر دپورٹ کمشنر، مقرر ہوا تو گھوگھہ اور بھروچ اس کے ماتحت رہے دسمبر ۱۷۵۴ء (۱۱۶۷ھ) اس کے

بعد مرہٹون کی لوٹ مار سے ملک مین سخت بدنظمی پیدا ہوگی، کھنبایت، بھروچ، سورت وغیرہ بندرون

پر جو لوگ قابض تھے وہ اس کے مالک بن بیٹھے، انگریزون کے قبضۂ گجرات تک یہی حال رہا، اس درمیان

مین انگریز بمبئی جزیرہ کو بحری مرکز بنا کر برابر ترقی دیتے رہے، یہان تک کہ بھروچ اور سورت دونون

پر قابض ہوگئے، اور کھنبایت کے نواب انگریزون کے مطیع ہوگئے، غرض تمام گجرات اور کاٹھیاواڑ پر

حاکم ہو جانے کے بعد تمام بندرگاہون پر ایسی ایسی شرطین عائد کین جس سے تقریباً کل بند ہوگئین اور تمام

صوبون کا بحری مرکز بمبئی ہوگیا، جو آج تک قائم ہے، بحری مرکز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بحری امور کا

سب سے بڑا افسر شاہ بندر یا امیر البحر اور ہر قسم کا بحری دفتر اسی جگہ رہتا ہو، اس افسر کا تقرر براہ راست

بادشاہ کی طرف سے ہوتا تھا، باقی بندرگاہین اس کے ماتحت ہوتی تھین، اور شاہ بندر اپنی طرف سے

دوسری بندرگاہون پر حاکم یا نائب بھیجتا تھا، جو اس کے احکام کی تعمیل کرتے تھے، (باقی)

خدمتِ حدیث مین خواتین کا حصہ (۱)

از

جناب مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین

(سلسلہ ماہ فروری سنہ ۱۹۵۱ء)

آٹھوین صدی کی محدثات کے بعد نوین صدی کی محدثات کا تذکرہ کیا جاتا ہے، اس صدی کی خواتین کے تذکرہ مین زیادہ تر شذرات الذہب اور الضوء اللامع سے مدد لی گئی ہے، الضوء اللامع مین ایک ہزار سے زیادہ خواتین کا تذکرہ ہے، جن مین نصف سے زائد خدمتِ حدیث مین حصہ لینے والی خواتین تھین ظاہر ہے کہ فرداً فرداً ہر ایک کے تذکرہ کی اس مضمون مین گنجائش نہین ہے، اس لیے مشاہیر کی خدمات کا ایک مختصر خاکہ یہان پیش کیا جاتا ہے، آسانی کے لئے نامون مین حروفِ تہجی کی ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے،

آمنہ بنت الصدر:- یہ قاضی احمد کی صاحبزادی تھین، متعدد علما سے حدیث پڑھی تھی، خصوصیت سے بخاری کا شیخ ابو الفرج سے پڑھی تھی، امام سخاوی نے ان سے حدیث کی اجازت لی تھی، نہایت پاکیزہ اخلاق تھین، سنہ ۸۶۶ھ مین وفات پائی، اس نام کی اور متعدد خواتین ہین، جو اس فہرست مین داخل کیجا سکتی ہین،

اسماء نام کی متعدد محدثات ہین، جن مین اسماء بنت عبد اللہ کے متعلق امام سخاوی نے لکھا ہے کہ ان کو ۶۰ شیوخ سے حدیث کی اجازت حاصل تھی، اور ان مین بعض ابن فہد اور امام سخاوی کے شیوخ مین ہین،

الف بنت علم الدین:- یہ ایک علم پرور امیر خاندان کی چشم و چراغ تھین، ان کے دادا نے ایک مدرسہ

بنوایا تھا، یہ اسی مدرسہ میں رہتی تھیں، یہ خود تو زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں، مگر علما، و محدثین کی ایک جماعت ہمیشہ اُن کے پاس رہتی تھی، جو

یقرؤن عندھا الحدیث والتفسیر	ان کے پاس حدیث و تفسیر کی قرأت کرتے رہتے تھے،

اس نام کی ایک خاتون الف بنت عبد اللہ تھیں، جن کے متعلق امام سخاوی نے لکھا ہے کہ

سمع منھا الفضلاء	ان سے فضلاے وقت نے سماع کیا تھا،

علم و فضل کے ساتھ نہایت عبادت گذار اور نیک کردار تھیں، ۸۷۰ھ میں وفات پائی،

ام الخیر امۃ الخالق، شیخ جمال حنبلی اور شرف بن کویک وغیرہ سے استفادۂ حدیث کیا تھا، مشہور محدث ابو العباس الحجار سے اپنے زمانہ میں یہ آخری راویہ تھیں، امام سخاوی نے ان سے اجازت حدیث لی تھی،

آنس بنت عبد الکریم:- یہ محمد بن انس نائب السلطنت کی نواسی تھیں، اُن کی والدہ سارہ اور اُن کی ایک بہن آمنہ کا شمار عالمات میں تھا، یہ محدث وقت حافظ ابن حجر کی اہلیہ تھیں، اور زیادہ تر ان سے حدیث پڑھی تھی، انہی کے واسطہ سے شیخ عراقی اور شرف بن کویک کی مرویات اور صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث کا سماع کیا تھا، خود درسِ حدیث دیتی تھیں، اُن کے درس کے بارے میں امام سخاوی لکھتے ہیں:-

حدثت بحضور شیخنا وبعدہ	حافظ ابن حجر کی موجودگی میں اور اُن کی
وقرء علیھا الفضلاء	وفات کے بعد بھی حدیث روایت کرتی
	تھیں، ان سے بڑے بڑے علماء نے حدیث پڑھی

حافظ ابن حجر کی موجودگی میں حدیث کا درس دینا اُن کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے،

امام سخاوی نے ان سے استفادہ کیا تھا، وہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"میں نے بہت سی چیزیں اُن سے حاصل کیں"

علم و فضل کے ساتھ صاحبِ زہد و تقویٰ بھی تھیں، الضوء اللامع میں ہے،

کانت رئیسۃ دینیۃ کریمۃ	بہت امیر، دیندار، فیاض، کار خیر میں
راغبۃ فی الخیر مجابۃ الدعاء	حاتم، اور مستجاب الدعوات تھیں،
یقال انھا رأت لیلۃ القدر،	کہا جاتا ہے کہ انھوں نے لیلۃ القدر
(جلد ۱۲ ص۱۱)	دیکھی تھی،

بائی خاتون بنت ابو الحسن، ابو بکر المزی وغیرہ شیوخ حدیث سے سماع کیا تھا، متعدد محدثین اور محدثات سے انھیں حدیث کی اجازت حاصل تھی، خود بھی درس حدیث دیتی تھیں، علم حدیث کے طلبہ اور اس فن سے ذوق رکھنے والوں سے انھیں خاص انس تھا، اپنے درس میں حدیث کا احترام اور سماع کرنے والوں کی سہولت کا بڑا لحاظ رکھتی تھیں، طلبہ کے سوالات اور سماعِ حدیث سے بالکل نہیں گھبراتی تھیں، اُن کا حلقۂ درس مصر و شام تک پھیلا ہوا تھا، امام سخاوی نے لکھا ہے

حدثت بالشام و مصر ...... و	شام و مصر دونوں جگہ درس حدیث دیتی
کانت خیرۃ من بیت علم و	تھیں، اسی کے ساتھ نہایت نیک کردار
ریاستہ ومحبۃ فی الحدیث،	صاحب ریاست اور صاحب علم خانوادہ
(صف)	سے تعلق رکھتی تھیں، علم حدیث سے انھیں خاص محبت تھی

امام سخاوی ان کے تلامذہ میں ہیں، ۸۶۲ھ میں وفات پائی،

بیرم بنت احمد:- ان کے والد احمد بن محمد کا شمار نویں صدی کے فقہا میں تھا، بیرم چونکہ انہی کی تربیت یافتہ تھیں، اس لئے ان پر بھی فقہی رنگ غالب تھا، ابتدائی تعلیم گھر میں پائی،

شمس الدین بن صائغ اور ان کی صاحبزادی فاطمہ سے قرأت سبعہ کی مشق کی تھی، اپنے والد کے ساتھ بیت المقدس گئیں، تو وہاں کے شیوخ سے سماعِ حدیث کیا، حافظہ نہایت قوی تھا، اس لئے ان کو مختلف فنون کی کتابیں ازبر تھیں، مثلاً کتاب العمدہ، رسالہ شاطبیہ، قصیدہ بردہ، عقیدۃ الغزالی اور امام نووی کی اربعین وغیرہ، امام سخاوی نے لکھا ہے کہ امام نووی کی حدیث کی مشہور کتاب ریاض الصالحین اور طہارۃ القلوب اکثر اُن کے مطالعہ میں رہتی تھیں، تاریخِ وفات معلوم نہیں ہو سکی،

ام بکر متر بنت محمد بن منجا، شام میں منجا نامی ایک خانوادہ تھا، جس نے علم و فضل کے لحاظ سے بڑی ترقی کی، اور یہ دولت اس کے پاس کئی صدی تک باقی رہی، ام بکر اسی خانوادہ کی ایک فرد تھیں، ان کو امام مزی اور امام برزالی جیسے شہرۂ آفاق محدثین کی صحبت حاصل تھی، مشہور محدثہ زینب بنت کمال، اور شہاب الحجاری وافش الشبلی سے سماع حدیث کیا تھا، خود بھی تحدیث کرتی تھیں، بہت سے ممتاز محدثین نے ان سے استفادہ کیا تھا، حافظ ابن حجر نے ان سے حدیث کی اجازت لی تھی، انھوں نے اپنی معجم میں ان کا تذکرہ کیا ہے، امام سخاوی لکھتے ہیں،

> سمع منھا الفضلاء اجازت لشیخنا، (ص [illegible])

ان سے بہت سے علما نے سماع کیا تھا، ہمارے شیخ (ابن حجر) کو بھی انھوں نے اجازت دی۔ [illegible]

۸۰۳ھ میں وفات پائی،

ام عبد اللہ بنتِ ناصر الدین، یہ ست التجار کے لقب سے مشہور تھی، غالباً اس لقب کی یہ وجہ ہو کہ اُن کے والد بڑے دولت مند اور ممتاز تاجر تھے، عز بن جماعہ سے ان کو اجازتِ حدیث تھی، انھوں نے شیخ کی مرویات کی ترتیب و تبویب بھی کی تھی، بڑے بڑے فضلا اُن کے تلامذہ میں ہیں، حافظ ابن حجر نے بھی اُن سے استفادہ کیا تھا، ۸۴۲ھ میں وفات پائی،

جویریہ - یہ حافظ ابو الفضل العراقی کی صاحبزادی تھیں، اپنے والد، ابو بکر ہیثمی، اور ابن حاتم اور دیگر محدثین سے حدیث پڑھی تھی، انھوں نے خود تحدیث شروع کی، تو اس وقت کے بیشتر علما نے ان سے سماع کیا، امام سخاوی جو ان کے شاگردوں میں ہیں، ان کے بارے میں لکھتے ہیں،

> کانت محبۃً فی الحدیث سمع منھا الائمۃ. (ص [illegible])

فنِ حدیث سے انھیں خاص شغف تھا، اور ان سے بہت سے ائمۂ وقت نے سماع کیا تھا،

۸۳۳ھ میں وفات پائی، اُن کے جنازہ میں بے شمار آدمی تھے، جس سے اُن کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے،

حسن السعدیہ: اس صدی کی مشہور محدثہ ہیں، بڑے بڑے فضلا اُن سے روایت کرتے تھے، ابن فہد ان کے تلامذہ میں ہیں، ۸۲۵ھ میں وفات پائی.

حسلہ بنت حسن:- امام برزالی اور امام مزی سے ان کو سماع حاصل تھا، ان سے ترمذی کے بعض حصے خاص طور سے انھوں نے پڑھے تھے، حافظ ابن حجر نے اپنی معجم الشیوخ میں اُن کا ذکر کیا ہے،

حلیمہ:- نام کی متعدد محدثات ہیں، جنھوں نے سماع اور تحدیث روایت میں حصہ لیا، الضوء اللامع میں ان کا تذکرہ موجود ہے،

خیفہ:- اُن کے ایک بھائی محمد تھے، جن کا شمار محدثین میں تھا، ان ہی کے ساتھ انھوں نے ابو نعیم کی مستخرج علی مسلم کا سماع کیا تھا،

خدیجہ بنت ابراہیم، آٹھویں صدی کے مشہور محدث قاسم بن المظفر سے ان کو سماع حاصل تھا، یہ نویں صدی میں ان سے آخری راویہ تھیں، متعدد ممتاز محدثین سے ان کو حدیث کی اجازت حاصل تھی،

حافظ ابن حجر ان سے کثرت سے روایت کرتے تھے، درس حدیث میں وہ مشہور تھیں، ان سے

بہت سے ائمۂ حدیث نے سماع کیا تھا،[۵]

۹۰ برس کی عمر میں ۸۰۳ھ میں وفات پائی،

خدیجہ بنت المولی:- اس صدی کی مشہور محدثہ عائشہ بنت الہادی سے مسند عمر شیخ ہروی کی ذم الکلام اور علی بن عاصم کے اجزاے حدیث کا سماع کیا تھا، امام سخاوی نے لکھا ہے کہ یوسف بن حسن جو اس صدی کے علماء میں ہیں، انہوں نے خدیجہ کے لئے اربعین کی تخریج کی تھی، (ص ۲۸)

خدیجہ بنت علی، اپنے والد کی معیت میں شیخ عز بن کویک سے موطا امام مالک پڑھی تھی خود بھی متعدد بار موطا کی تحدیث کی تھی، امام سخاوی نے موطا انہی سے پڑھی تھی، مطالعہ کا خاص ذوق تھا، اور یہ ذوق آخری عمر تک باقی رہا، عورتوں کے مخصوص مسائل سے اُن کو پوری واقفیت تھی، اسی کے ساتھ نہایت زاہدہ اور پاکیزہ اخلاق تھیں، (ص ۲۹)

خدیجہ بنت عمر: ابن صدیق اس صدی کے محدث تھے، ان ہی سے صحیح بخاری کا بیشتر حصہ اور ثلاثیات دارمی کا سماع کیا تھا، جو کچھ پڑھا تھا، اس کی تحدیث بھی کرتی تھیں، کبار علماء نے ان سے روایت کی ہے، ۸۶۰ھ کے قریب ان کی وفات ہوئی،

اس نام کی اور متعدد محدثات ہیں، مثلاً خدیجہ بنت فرج الزیلعیہ، خدیجہ بنت النور متوفاة ۸۳۰ھ خدیجہ بنت ابوعبداللہ متوفاة ۸۶۷ھ وغیرہ،

رقیہ بنت الشرف محمد ان کا خانوادہ علم حدیث میں ممتاز تھا، ان کے دادا، والد، اور چچا کا شمار محدثین میں تھا، الضوء اللامع میں ہے،

من بیت حدیث بل عمہا	حدیث کا ذوق رکھنے والے خانوادہ سے تھیں
ابو الفرج مسند القاہرۃ،	انکے چچا ابو الفرج تو قاہرہ کے ممتاز اور مسلم محدثین میں تھے

[۵] الضوء اللامع جلد ۱۲ ص ۲۵،

خود اُن کے شوہر کو فنِ حدیث میں درک تھا، اس ماحول میں رقیہ کی تعلیم و تربیت ہوئی، فنِ حدیث اپنے خاندان کے علاوہ دوسرے ممتاز شیوخ حدیث سے حاصل کیا، یحیٰی بن یوسف البصری جیسے محدثین سے ان کو سماع حاصل تھا، امام سخاوی اُن کے شاگردوں میں ہیں، ان کے بعض اقران رقیہ سے کثرت سے روایت کرتے ہیں،

رقیہ بنت یحیٰی، امام مزی، امام ذہبی، امام برزالی، اور زینب بنت کمال وغیرہ جیسے سرآمد روزگار محدثین سے ان کو اجازت حاصل تھی، حافظ ابن حجر نے اپنی معجم الشیوخ میں ان کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے:

انھا روت الکثیر ولم القھا	انہوں نے کثرت سے روایت کی ہے، مگر میں اُن سے ملاقات نہیں کرسکا،

امام سخاوی لکھتے ہیں،

حدثت سمع منہا الائمۃ	حدیث بیان کرتی تھیں، ان سے ائمہ حدیث
.... حدثنا عنہا جماعۃ کثیرون	نے روایت کی ہے، ہم سے متعدد اشخاص
وفی الاحیاء ببلاد الحجاز الآن	نے روایت کی ہے، حجاز کے مختلف شہروں
من سمع منہا، (ص ۳۶)	میں ان سے سماع رکھنے والے موجود ہیں،

زلیخا بنت ابراہیم، ان کے والد ابراہیم کا شمار علماء میں تھا، اُن کی والدہ اور اُن کی ایک بہن بھی علمی حیثیت سے ممتاز تھیں، حافظ زین الدین عراقی اور ابوبکر ہیثمی سے انہوں نے صحیح بخاری اور ابوداؤد پڑھی تھی، ان اماموں کے علاوہ صحیح بخاری دوبارہ حافظ علی التنوخی سے پڑھی، خود بھی تحدیث روایت کرتی تھیں، ۸۶۰ھ میں وفات پائی،

زینب بنت ابراہیم، یہ زلیخا کی بہن تھیں، صحیح بخاری اور ابوداؤد کا سماع انہیں بھی حاصل تھا، بعض خصوصیات میں یہ اپنی بہن سے ممتاز تھیں، امام سخاوی لکھتے ہیں،

كانت كاتبة و نظرت	لکھنا جانتی تھیں، علم و فن کی کتابیں
فى كتب العلوم كثرت من	مطالعہ کرتی تھیں، اور کثیر العبادت
العبادة وسمع منها الطلبة	تھیں، ان سے بہت سے طلبہ نے سماع
(ص ۳۹)	کیا تھا،

خود امام سخاوی بھی اُن کے تلامذہ میں ہیں، [illegible]ھ میں وفات پائی،

زینب بنت احمد:- یہ مکہ میں پیدا ہوئیں، اور وہیں سنن ابن ماجہ اور مسند ابو یعلی کے بعض حصوں کا سماع کیا، زین الدین العراقی اور ابو بکر ہیثمی جیسے محدثین سے انھیں اجازت حاصل تھی، اپنے مسموعات کے علاوہ دوسرے محدثین کی مرویات کی بھی انھوں نے متعدد بار تحدیث کی تھی، ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائی،

زینب بنت عبد الرحیم:- یہ شیخ زین الدین العراقی کی صاحبزادی تھیں، اپنے والد اور ابو بکر ہیثمی سے سماع حدیث کیا تھا، حدیث کی کتابوں میں خصوصیت سے مسند احمد بن حنبل کی روایت و تحدیث میں یہ ممتاز تھیں، امام سخاوی اُن کے تلامذہ میں ہیں، اُن کی روایتِ حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں،

حدثت بالكثر وسمع منها الفضلاء	کثرت سے روایت کی ہے، اُن سے ممتاز محدثین نے سماع کیا تھا،

زینب بنت عبد اللہ: ان کے والد عبد اللہ اور اُن کے بھائی ابراہیم کا شمار محدثین میں تھا، اس خانوادے کے دوسرے افراد کو بھی حدیث سے شغف تھا، زینب نے اہلِ خاندان کے علاوہ دوسرے محدثین سے بھی حدیث کا سماع کیا تھا، امام سخاوی نے بھی اُن سے اکتسابِ فیض کیا تھا، اُن کے بارے میں لکھتے ہیں،

من بيت حديث ورواية	روایت و حدیث سے شغف رکھنے والے
حدثت سمع منها الفضلاء	خاندان سے تھیں، خود بھی روایت کرتی
(ص ۴۲)	تھیں، ان سے بہت سے فضلا نے سماع کیا تھا،

زینب بنت علی، اُن کے والد علی بن محمد ممتاز حافظ قرآن و حدیث تھے، زینب کو انھوں نے شروع میں حافظ قرآن کرایا، اس کے بعد کتاب العمدۃ الحاوی مختصر ابی شجاع پھر اس کے بعد بخاری اور مسلم پڑھائی، تحصیل کے بعد زینب نے خود درس دینا شروع کیا، ان کی مجلس درس صلاح الدین ابن حنبلی کے گھر میں منعقد ہوتی تھی، (ص ۴۵)

زینب بنت الکمال، یہ اس خانوادہ کی نورنظر تھیں، جس میں علم و فن خصوصیت سے علم حدیث کا خاص چرچا تھا، انکی والدہ اور انکی بہن فاطمہ کا شمار محدثات میں تھا، یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انھوں نے حدیث کا اکتساب کس سے کیا تھا، امام سخاوی نے لکھا ہے کہ قرآن کی قاریہ تھی، مطالعہ کا خاص ذوق تھا، خصوصیت سے سیرتِ نبوی کے مطالعہ کا،

سادۃ بنت عمر:- ابن البخاری کے اصحاب سے انھیں سماع حاصل تھا، امام سخاوی نے لکھا ہے کہ انھوں نے کثرت سے روایت کی ہے، ان سے ممتاز ائمۂ حدیث نے سماع کیا تھا، اس تذکرہ کے بعد لکھتے ہیں،

نزل اهل مصر لموتها فى	اہلِ مصر اُن کی موت کے بعد روایت
الرواية درجة	میں ایک درجہ نیچے آ گئے،

اس سے اُن کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے،

زینب، سارۃ، ست العرب اور صالحہ وغیرہ نام کی متعدد محدثات ہیں، جو اس فہرست میں داخل کی جا سکتی ہیں، مگر قصداً نظر انداز کر دیا گیا ہے،

عائشہ بنت الصادر:- فخر بن البخاری کے اصحاب سے ان کو سماع حاصل تھا، اُن کے علاوہ دمشق قاہرہ اور بعلبک کے شیوخِ حدیث سے انھون نے اکتسابِ فیض کیا تھا، بعلبک کے مشہور محدث ابن امیلہ سے ابوداؤد اور ترمذی پڑھی تھی، ان کتابون کے علاوہ دوسرے شیوخِ حدیث کی مرویات اور تخریجات کا سماع بھی کیا تھا،

اُن کی مرویات کثرت سے ہین، اور اُن سے متعدد ائمۂ حدیث نے سماع کیا تھا، امام سخاوی لکھتے ہین

حدثت بالکثیر سمع منھا الائمۃ (الضوء اللامع جلد ۱۲ ص ۳)

کثرت سے روایتین کی ہین، ان سے ائمۂ حدیث نے سماع کیا ہے،

حافظ ابن حجر اور خود امام سخاوی اُن کے تلامذہ مین ہین، ۷۶۰ھ کے قریب دمشق مین پیدا ہوئین، اور ۸۴۲ھ مین بیمارستان نوری مین وفات پائی،

عائشہ بنت علی:- اس صدی کی ممتاز خواتین مین ہین، اُن کے گھرانے مین متعدد اشخاص علم حدیث سے شغف رکھتے تھے، اُن کے نانا ابوالحرم، اور اُن کے والد ابوالحسن علی کا شمار محدثین مین تھا، ان کے صاحبزادے احمد کا شمار علماء مین ہوتا تھا،

انھون نے سب سے پہلے اپنے نانا سے متعدد اجزاء کا سماع کیا تھا، ان کے بعد عز بن جماعہ اور موفق الحنبلی سے مسند الشافعی پڑھی، ان کے علاوہ متعدد مصری اور شامی علماء حدیث سے اجازت حاصل کی، خود بھی تحدیث کرتی تھین، اُن سے متعدد ائمۂ حدیث نے سماع کیا ہے، حافظ ابن حجر نے اپنی معجم مین ان کا تذکرہ کیا ہے، انکے بارے مین لکھا ہے کہ آخر عمر مین اُن سے استفادہ کرنے والون کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، امام سخاوی اُن کے بارے مین لکھتے ہین،

من بیت علم و روایۃ ذاکرۃ من الاحادیث

اہلِ علم اور اصحابِ حدیث خانوادہ سے اُن کا تعلق تھا، انھین احادیث زبانی یاد تھین،

علم حدیث کے ساتھ سیرتِ نبوی اور فقہ سے بھی شغف تھا، شعراء کے بہت سے کلام زبانی یاد تھے، اسی کے ساتھ فہم و ذکا اور قوتِ حافظہ کی دولت سے بھی بہرہ ور تھین، غرض علم و فضل کے لحاظ سے نوین صدی کی ممتاز خواتین مین تھین،

قل ان تری العیون فی النساء مثلھا، (ضوء جلد ۱۲ ص ۸)

خواتین مین اُن کی جیسی خاتون کم ہی دیکھی گئی،

۸۴۰ھ مین وفات پائی، قاضی برہان الدین سے اُن کی شادی ہوئی تھی، ابن عماد نے لکھا ہے کہ اپنے نانا سے روایت کرنے والون مین یہ آخری راویہ تھین، (شذرات الذہب جلد ۷، ص ۲۳۲)

عائشہ بنت الہادی:- یہ بھی نوین صدی کی ممتاز اور مشہور خاتون تھین، امام سخاوی نے انھین "مسندۃ الدنیا" کے لقب سے یاد کیا ہے، انھون نے آٹھوین صدی کے سب سے ممتاز محدث شیخ حجار سے صحیح بخاری اور شیخ عبداللہ بن حسن سے صحیح مسلم پڑھی تھی، اُن کے علاوہ دوسرے متعدد محدثین سے انھون نے سماع کیا تھا، اور اجازت حاصل کی تھی، الضوء اللامع مین ہے:

انفردت عن اجل شیوخھا بالسماع والاجازۃ فی سائر الآفاق،

بڑے بڑے شیوخ سے سماع اور اجازت مین یہ تمام ممالک اسلامیہ مین ممتاز تھین،

تحصیل کے بعد جب مسندِ تحدیث و روایت پر متمکن ہوئین، تو تشنگانِ حدیث ہر طرف سے جوق در جوق آکر اس چشمۂ فیض سے اپنی پیاس بجھانے لگے، الضوء اللامع مین ہے،

روت الکثیر و اخذ عنھا الائمۃ سیما الرحالۃ فاکثروا و کانت سھلۃ فی الاسماع،

کثرت سے روایت کرتی تھین، اُن سے ائمۂ حدیث نے استفادہ کیا تھا، خصوصیت سے باہر سے آنے والے طلبہ اُن سے بہت مستفید ہوئے، اسماعِ حدیث مین بڑی

حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ اس وقت بھی اجازۃً ان کے روایت کرنے والے کثرت سے موجود ہیں اور سماعاً روایت کرنے والوں میں بھی متعدد افراد موجود ہیں،

تحدیثِ روایت کے سلسلہ میں وہ متعدد چیزوں میں منفرد تھیں، مثلاً سند عالی کے ساتھ بذریعہ سماع وہ اپنے زمانہ میں بخاری کی آخری راویہ تھیں نیز شیخ حجاز سے روایت کرنے والوں میں اُن کے زمانہ میں ان کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا،

حافظ ابن حجر کے شیوخ میں ہیں، ۸۰۳ھ میں وفات پائی،

فاطمہ نام کی بھی متعدد خواتین ہیں جنھوں نے خدمتِ حدیث میں حصہ لیا خصوصیت سے فاطمہ بنتِ محمد کے متعلق امام سخاوی نے لکھا ہے کہ

تفردت بالرواية عنهم في الدنيا وحدثت بالكثير سمع منها الائمة (ضوء اللامع)

مذکورۂ بالا شیوخ سے روایت میں یہ منفرد تھیں، کثرت سے روایت کرتی ہیں، ان سے ائمۂ فن نے سماع کیا ہے،

مریم بنت احمد، یہ ایک علمی خانوادہ کی فرد تھیں، اُن کو حدیث سے خاص شغف تھا، وانی اور دبوسی، اور سلفی جیسے محدثین سے ان کو سماع حاصل تھا، صحیح مسلم اور دمشق، مصر اور حجاز کے علمائے حدیث کی مرویات کا خصوصیت سے انھوں نے سماع کیا تھا، جو ان کو مستحضر تھیں، حافظ ابن حجر ان کے تلامذہ میں ہیں، حافظ سخاوی نے بھی ان سے استفادہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"میں نے اُن سے ایک معجم کی تخریج کی ہے، اور اُن کی بہت سی مسموعات کو خود اُن سے سماع کیا ہے"

پھر لکھتے ہیں :-

نعم الشيخة كانت ديانةً وصيانةً ومحبةً في العلم،

نہایت متدین پاکباز، اور علم سے محبت رکھنے والی خاتون تھیں،

ام ہانی مریم بنت نورالدین :- یہ نویں صدی کی سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز خاتون تھیں، اُن کے گھر میں علم و فن شعر و ادب کا چرچا مدتوں سے چلا آرہا تھا، اُن کے والد، دادا اور نانا، اور کئی لڑکوں کا شمار علماء و محدثین میں تھا، لیکن اُن کی علمی غور و پرداخت سب سے زیادہ اُن کے نانا قاضی فخرالدین نے کی، یہ مصر کی رہنے والی تھیں،

انھوں نے سب سے پہلے قرآن حفظ کیا، اس کے بعد فقہ و ادب میں دستگاہ بہم پہنچائی، اس کے بعد اُن کے نانا اُن کو مکہ مکرمہ لے گئے، جہاں شیوخِ حدیث کی خدمت میں حدیث کا سماع کرایا، مصر و حجاز کے بیشتر ممتاز محدثین سے انھوں نے استفادہ کیا تھا، تقریباً صحاح کی تمام کتابیں انھوں نے سماع کی تھیں، صحیح بخاری خاص طور سے شیخ تناوری سے پڑھی تھی، حدیث کی تکمیل کے بعد خود مسند تحدیث پر فائز ہوئیں، حافظ سخاوی اُن کے شاگرد ہیں، خود لکھتے ہیں،

قد حدثت قديماً سمع منها الفضلاء وقرأت عليها جميع ما وقفت عليه من مرويها،

بہت دنوں سے تحدیث کرتی تھیں، ان سے بہت فضلاء نے سماع کیا تھا، میں جس قدر اُن کی مرویات سے واقف ہو سکا، اُن کو اُن سے پڑھا،

پھر ان کی دینداری، اخلاق، اور محبت حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں،

وهي امرأة صالحة فاضلة كثيرة البكاء عند ذكر الله ورسوله محبته في الحديث

یہ ایک صالحہ اور فاضلہ خاتون تھیں، اللہ اور رسول کے تذکرہ کے وقت اُن پر گریہ طاری ہوجاتا

واھلہ مواظبتہ علی الصوم	تھا، حدیث اور محدثین سے انھیں محبت
والتھجد	تھی، روزے اور تہجد پر مواظبت کرتی
حجت ثلاث عشرۃ مرۃ،	تھین، انھون نے تیرہ حج کئے تھے،

[illegible]ھ مین پیدا ہوئین، اور ۹۳ برس کی عمر مین [illegible]ھ مین وفات پائی، خوش قسمتی

سے وفات مکہ مین ہوئی، اور امام شافعی کے مرقد کے قریب سپرد خاک کی گئین،[1]

انہی پر نوین صدی ہجری کی محدثات کا تذکرہ ختم کیا جاتا ہے،

---

[1] الضوء اللامع ص ۸۵، جلد ۱۲،

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

جلد چہارم

منصب نبوت کی تشریح، قبل اسلام عرب کے اخلاقی حالات، تبلیغ نبوی کے اصول، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ کام، اسلام اور اس کے عقائد پر مفصل اور حکیمانہ مباحث، زیر طبع۔

جلد دوم مہاجرین اول

اس مین خلفاے راشدین کے علاوہ بقیہ حضرات عشرہ مبشرہ، اکابر بنی ہاشم و قریش، اور ان صحابہ کے حالات و سوانح، اخلاق، اور فضائل کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے، شروع مین ایک مفصل مقدمہ مین قریش کی تاریخ، اور قبائل مہاجرین کی تفصیل کی گئی ہے، اور مہاجرین کے مخصوص فضائل بیان کئے گئے ہین، زیر طبع،

منیجر

اقبال اور نطشے

از

جناب ڈاکٹر عشرت حسن صاحب انور ایم اے، پی ایچ ڈی، لکچرار فلسفہ مسلم یونیورسٹی

(۳)

اقبال کو جب وجدانِ ذات میسر ہوا، تو جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے عجیب اتفاق سے وہ برگسان کے فلسفہ سے بالکل غیر متعلق سے ہو گئے، انھین محسوس ہوا کہ برگسان کا وجدان اس "خودی" اور "انانیت" کی تائید نہین کرتا جس کا اُن کو وجدان ذات کے ذریعہ شعور پیدا ہو رہا تھا، اس مقام پر پہونچکر وہ برگسان کے مقابلہ مین نطشے کے فلسفۂ خودی کو اپنے لئے زیادہ مفید رہنما تصور کرنے لگے، نطشے کی طرح ان کا بھی کچھ ایسا خیال ہوا کہ فعالی حالت مین انسان پر اپنی خودی کا راز فاش ہو جاتا ہے، اور بڑے بڑے مقاصد اور اعلیٰ ترین حوصلون تک پہنچنے مین جو کاوشِ فکر کرنی ہوتی ہے، اور جو ذوق و شوق اور جوش و خروش پیدا ہوتا ہے، وہ ہم کو ہماری شخصیت کی پوری گہرائی تک لیجاتا ہے، اس وقت یہ راز کھلتا ہے کہ ہم ایک ایسی قوت کے حامل ہین، جو وحید اور بے مثل ہے، اس طاقت اور جبروت کو "زور خودی" کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، نطشے کو اس "زور خودی اور مقام انانیت" کا وجدان ضرور میسر ہوا تھا، وہ اپنی ذات کی گہرائی مین ڈوب کر صحیح طور پر یہ محسوس کر سکا تھا، کہ خودی ہی ایک اصل حقیقت ہے، یہی ایک ایسا نقطہ ہے جس سے تمام کائنات منسوب ہے،

کائنات کو علوم و فنون کے ذریعہ سمجھا جاتا ہے، اور تمام علوم و فنون "ہماری خودی" کے مظاہر ہین، ادر حق بات ہمارے فطری رجحانات کی بنا پر حق ہے، اسی طرح غلط بات ہمارے فطری رجحانات کی بنا پر غلط ہے،

ہم اپنے نظریات اپنے آپ بناتے ہین، جو بات پسند خاطر ہوتی ہے، اس کو ہم اچھا کہتے ہین، جو بات نامقبول ہوتی ہے، ہم کو بد مزہ لگتی ہے، اس کو ہم برائی سے تعبیر کرتے ہین، اس طرح ہماری خودی اخلاقیات، الہیات، اور ارضی وسماوی تمام احکامات وانکشافات مین ہر جگہ جلوہ افروز رہتی ہے، یعنی عالم کو ہم جس طرح بھی سمجھین، ہر صورت مین یہ تمام نظریات ہماری خودی کا مظاہرہ ہوتے ہین، مختصر یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق ہی ہماری خودی کا نتیجہ ہے، اس مین جو کچھ بھی نظر آتا ہے، وہ ہماری ہی نظر کا کرشمہ اور ہماری خودی کا ہی پرتو ہے،

اقبال نیطشے کے مذکورۂ بالا خیالات ونظریات سے پورے پورے طور پر ہم آہنگ ہین، مثلاً نیطشے کی طرح شوپن ہار کے قنوطی فلسفہ کی تردید مین کہتے ہین،

درمان زدرو ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

اے کہ گل چیدی منال از نیش خار
خارہم می روید از باد بہار

گلہ از سختی ایام بگذار
کہ سختی ناکشیدہ کم عیار است

نمی دانی کہ آب جویباران
اگر بر سنگ غلطد خوشگوار است

وائے آن قافلہ کز دونی ہمت می خواست
رہ گذارے کہ دروہیچ خطر پیدا نیست

یا پھر نیطشے کی طرح اس امر کی تیقن کرتے ہوئے کہ خودی ہی زندگی کا راز ہے، کہتے ہین

ہر چیز ہے محو خود نمائی
ہر ذرہ شہید کبریائی

بے ذوق نمود زندگی موت
تعمیر خودی سے ہو خدائی

وہ اس بات مین بھی نیطشے کے ہم خیال ہین، کہ "خوب" و ناخوب کی تمیز بھی خودی ہی کرتی ہے،

نمود جس کی فراز خودی سے ہو وہ جمیل
جو ہو نشیب سے پیدا قبیح و نامحبوب

پھر نیطشے ہی کی طرح یہ خیال کرتے ہین کہ خودی کا مظاہرہ طاقت اور جبروت مین ہوتا ہے، اور اسی بنا پر "خوب" خوب کہا جاتا ہے اور "ناخوب ناخوب"۔

خوب زشت است اگر پنجۂ گیرات شکست
زشت خوب است اگر تاب وتوان تو فزود

یہان تک وہ نیطشے کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد نیطشے کی طرح جہان سنگ وخشت ہی کو خودی کا پرتو ماننے لگتے ہین :-

وہی جہان ہے ترا جس کو تو کرے تعمیر
یہ سنگ وخشت نہین جو تری نگاہ مین ہے

غرض اقبال اور نیطشے دونون کے لئے کائنات کی فطرت "خودی" کے جلوہ مین ہر جگہ نظر افروز ہے، ہر ایک ذرۂ کائنات اس کا مظہر ہے، برگسان نے کائنات کو "زور زندگی" کا مظہر بتایا تھا، لیکن اگر "زور زندگی" کی خطری گہرائیون مین جایا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اصول حیات ایک بلند تر اصول کا تابع ہے، اس کو اقبال "زور خودی"[1] کے نام سے تعبیر کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہین، زندگی کے مظاہر ہر جگہ مختلف اور وحید بے شمل ہین، برگسان کے عقیدہ کی رو سے یہ اختلاف زندگی کی مختلف ضروریات کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے، لیکن اگر زندگی کے لئے زندگی کا مظاہرہ ضروری ہے، تو پھر ظاہری وباطنی اختلاف کیون پیدا ہوا، اس کا جواب برگسان کے پاس نہین ہے اقبال اس کا یہ جواب دیتے ہین، کہ "زندگی" "خودی" کا جلوہ دکھانے پر مجبور ہے، "خودی" زندگی کے لئے مایۂ حیات ہے۔

یہ وحدت ہے کثرت مین ہر دم اسیر
مگر ہر جگہ بے چگون بے نظیر

یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

پسند اس کو تکرار کی خو نہین
کہ تو مین نہین اور مین تو نہین

من و تو سے ہے انجمن آفرین
مگر عین محفل مین خلوت نشین

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی جلوہ بدمست وخلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی مین بند

---

[1] یہ ترکیب اقبال نے خود استعمال نہین کی ہر ضرورت کے تحت خاکسار نے بہت ڈرتے ڈرتے ایجاد کرنے کی ہمت کی ہے،

اب اگر زور زندگی کا مقصود خودی کا حاصل کرنا اور اس کی پرورش کرنا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کیلئے کثرت اور اختلافِ ظاہری و باطنی ضروری ہے،

حاصلِ کلام یہ ہے کہ زندگی خودی کا جلوہ دکھانے پر مجبور ہے، اور وہ ہر جگہ بے مثل اور خود پسند بن کر جلوہ نمائی کر رہی ہے، زندگی کے ہر ایک منظر مین ایک مخصوص آن اور ایک نئی شان ظاہر ہوتی ہے، زندگی کا ہر ایک مظاہرہ خود پسندی، خود بینی اور خودی کی جلوہ نمائی کرنے پر مجبور ہے،

یہ جو کچھ نیطشے نے کہا تھا اقبال نے اس کو من و عن مان بھی لیا تھا، لیکن "خودی" کی وہ تعریف جو نیطشے نے کی تھی، اگرچہ درست ہے لیکن بڑے خطرناک نتائج کا پیش خیمہ تھی، اُس نے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے "خودی" کی تعریف یہ کی تھی کہ "غیر خود" کی طرف مطلق توجہ ہی نہ کی جائے، جس سے ہزارہا قسم کے معاشرتی، سیاسی، اخلاقی، اور مذہبی خرابیان پیدا ہوتی تھین، اور یہ تعلیم اسلام کی تعلیمات کے بھی منافی تھی، مثلاً معاشرتی زندگی مین اسلام نے مان باپ، عزیز، اقربا، اور ہمسایہ تک کے حقوق تسلیم کئے ہین، سیاسیات مین بھی یہی صورت ہے، دوسری اقوام کے افراد کے ساتھ انصاف اور رواداری کے برتاؤ کی تلقین کی ہے، نیطشے کی طرح یہ نہین کہا گیا کہ حاکم مطلق العنان ہے، جو چاہے سو کرے، نیطشے کا فلسفۂ خودی اخلاق اور مذہب کی بنیادون کے لئے بھی تباہ کن تھا، مثلاً نیطشے کا خیال تھا کہ مافوق البشر انسان ہی حاکم بننے کے قابل ہے، وہی خیر و شر کے نظریات کا "خالق" ہو سکتا ہے، جو فعل اس کے پسند خاطر ہے، وہی اچھا ہے، جو بات اس کو ناپسند ہو وہی نامقبول، نامحبوب اور بُری ہے، اس طرح کوئی "اخلاقی خوبی" اخلاقی خوبی کہلائے جانے کے قابل نہین، بلکہ وہ صرف ایک مخصوص قہار و جبار شخص کی تخلیق ہوگی، جس بات کو یہ قہار اور جبار حاکم "برا" کہدے، وہ بات بُری ہو جائے گی، اور جس کو اچھا کہدے گا، وہی اچھی ہو جائے گی، کمزور لوگون کے لئے بہر حال اُن کی اطاعت کرنا واجب ہے، اُن کو اُنہی کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا ہے، انہی کے احکام کی تعمیل مین لگے رہنا ہے، یہ کمزور لوگ نہ خود کچھ سوچ سکتے ہین، اور نہ اُن کو غور و فکر کرنے کا حق ہی ہے، غلام کا اخلاق ہمیشہ غلامانہ اخلاق ہی

کہلائے گا، اس مین وہ بلند آہنگی اور آزادی نہین ہوتی، جو حاکم کے نظریۂ اخلاق مین پائی جاتی ہے، حاکم کا نظریۂ اخلاق خود پسندی، خود بینی، آزادی، بیباکی، بے رحمی، حکومت، دولت، طاقت کا مظاہرہ ہوتا ہے، غلام کا نظریۂ اخلاق غلامی، کمزوری، دردمندی، ہمدردی اور خاکساری کا مظہر ہوتا ہے، اور چونکہ موخر الذکر نظریۂ اخلاق انسانی خودی اور شخصیت کے منافی ہے، اس لئے اس نظریۂ اخلاق کے حامیون کو یک لخت ختم کر دینا ضروری ہے، ایسے لوگون کی موت انسانی شخصیت اور انسانی خودی کے مفاد کے لئے ضروری ہے، ان لوگون کو ختم کر دینے کے بعد ہی یہ امید کی جا سکتی ہے کہ دنیا مین "حاکمانہ اخلاق" کے نظریات کی نشر و اشاعت اور اُن کی مقبولیت ہو سکے گی، اور مافوق البشر انسان جس کے لئے دنیا ہزارہا سال سے چشم براہ بیٹھی ہے، وجود مین آسکے گا،

نیطشے کا فلسفہ اخلاق ہی کی نہین، بلکہ مذہب کی بھی تردید کر رہا تھا، نیطشے کا خیال تھا کہ انسانی فروغ و ارتقا اور خود پروری کے لئے ضروری ہے کہ نعوذ باللہ خدا کے وجود سے یکسر انکار کر دیا جائے، نیطشے کے فلسفہ کی رو سے یہ انکار ایک اور وجہ سے بھی ضروری تھا، جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، نیطشے کا خیال تھا کہ تمام علمی، اور عملی نظریات خودی کی بالیدگی کے لئے بنائے جاتے ہین، اس لئے کسی زمانہ مین ذاتِ باری تعالیٰ کا عقیدہ بھی کسی ضرورت کے تحت تشکیل کیا گیا ہوگا، لیکن ایک عرصہ سے اس عقیدہ اور نظریہ کا اصل مقصد فوت ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس لئے اب اس نظریہ یا عقیدہ کی قطعی ضرورت نہین،

اقبال نے محسوس کیا کہ نیطشے کا فلسفۂ خودی سراسر تخریبی[۱] ہے، اور وہ معاشرت، سیاست، اخلاق، مذہب، فکر و عمل کے تمام نظامون کی بنیادون کو متزلزل کرنے کے بعد کوئی تعمیری لائحہ عمل پیش نہین کرتا، اور بجز ذاتی خودی کے ہر ایک چیز کی نفی کرتا ہے، اور اس بات پر غور و فکر شروع کی کہ نیطشے کا ذاتی خودی کے علاوہ ہر ایک شے کا انکار کرنا کہان تک درست ہے، اگر بقول نیطشے ذاتی خودی ہی اصل وجود ہے تو

---

[۱] ہم یہان نیطشے کے فلسفۂ خودی کے بہت سے پہلو نظر انداز اور انہی کے ذکر پر اکتفا کرین گے جن کا اقبال کے فلسفہ سے براہ راست کوئی تعلق ہے،

کسی قسم کا اعلیٰ معاشرتی نظام وجود ہی میں نہیں آسکتا، سیاست میں یہ خرابی زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے اور اس میدان میں نیطشے کا فلسفۂ خودی خود اپنی تردید کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے، ایک طرف وہ یہ کہتا ہے کہ خودی کی پرورش، اعلیٰ ترین قدر ہے، لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ صرف حاکم ہی اس خودی کے حصول کے لائق ہے، وہ جس طرح چاہے حکومت کرے، کمزوروں اور محکوموں کو اس کا حق نہیں کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف اپنی رائے یا اپنے دیکھے ہوئے راستہ پر چل سکیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی طرح آزاد رہنے کے قابل نہیں، اور ان کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ اپنی خودی کی تعمیر یا تشکیل یا توسیع کرسکیں،

نیطشے کا نظریۂ خودی اخلاقیات سے بھی ٹکرا رہا تھا، گو کہنے کو اس نے مروجہ غلامانہ اخلاق کے خلاف ہی آواز بلند کی تھی، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کا فلسفہ ہر ایک فلسفۂ اخلاق کے منافی تھا، اخلاق کا بنیادی اصول معاشرتی زندگی ہے، اور نیطشے "غیر خود" کو نظر اٹھا کر دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا، اور اس کے نظریۂ اخلاق میں صرف طاقت اور جبروت کی جگہ تھی، کیونکہ ان کا تعلق ذات نفس سے ہے کسی معاشرتی، اور اجتماعی زندگی سے نہیں، لیکن ان تمام اخلاقی اوصاف و ملکات کی قطعی گنجایش نہ تھی، جو معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے وجود میں آتے ہیں، مثلاً عدل، یا سخاوت یا محبت وغیرہ،

نیطشے کے فلسفۂ خودی نے تخریبی ہونے کے باوجود نظام معاشرت، سیاست، اور اخلاق میں کسی حد تک کچھ تعمیری کام بھی کیا، مثلاً معاشرتی نظام کے سلسلہ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نیطشے کے نظریۂ خودی نے لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کی کہ ایسے پختہ تر انسانوں کی پیدایش کی ضرورت ہے، جن سے سوسائٹی اور معاشرتی نظام میں ترقی اور فروغ ہوسکے، نیز سیاست میں بھی نیطشے کا فلسفہ اس بات کا دعویدار کہا جاسکتا ہے کہ

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں — لوگوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے
(اقبال)

سیاست میں نیطشے کا یہ خیال بھی کسی حد تک صحیح تھا کہ ملت اور قوم کسی ایک فرد کے ضمیر کی آواز ہوتی ہے، اور کوئی ایک شخص ضرورت کے تحت لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے، اور ایک مخصوص ملت وجود میں آجاتی ہے،

فرد بر می خیزد از مشت گلے — قوم زاید از دل صاحب دلے (اقبال)

اخلاق میں بھی نیطشے کے فلسفۂ خودی سے بعض انقلابی نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں، مثلاً غلامانہ اخلاق صحیح معنی میں اخلاق نہیں ہے، اچھے اخلاق اور کردار کے لئے مکمل آزادی کی ضرورت ہے، یا یہ کہ وہ اخلاقی نظریات کسی طرح بھی اخلاقی نہیں کہے جاسکتے، جو زندگی کی نفی کرتے ہوں، اور انسانی آزادی کے منافی ہوں،

مذکورۂ بالا تمام انقلابی نظریات جو مذاق خودی کی حمایت سے اخذ کئے گئے ہیں، اقبال کو اسی قدر پسند تھے جس قدر خود نیطشے کو تھے، مثلاً خودی کے فلسفہ کو بنیادی اصول قرار دیتے ہوئے اقبال بھی نیطشے کی طرح معاشرتی نظام میں ایک پختہ تر انسان کی تلاش میں ہیں، البتہ اس پختگی کی تعریف میں انھوں نے نیطشے سے اختلاف کیا ہے، مثلاً کہتے ہیں :-

اے حلقۂ درویشاں وہ مرد خدا کیسا — ہو جس کے گریبان میں ہنگامۂ رستاخیز
جو ذکر کی گرمی سے شعلہ کی طرح روشن — جو فکر کی سرعت سے بجلی سے زیادہ تیز
(بال جبریل)

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

زادن طفل از شکست عالم است — زادن مرد از شکست عالم است
جان بیدارے چو زاید در بدن — لرزہا افتد درین دیر کہن

لہ خط کشیدہ صفات و ملکات نیطشے کے مافوق البشر انسان میں یکسر معدوم ہیں،

نگہ یہ مرد از رنج و غم و درد
ز دوران کم نشیند بر دلش گرد

قیاس او را مکن از گریۂ خویش
کہ ہست از سوز و مستی گریۂ مرد

(ارمغان حجاز)

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و اسرافیل کا صیاد ہے مومن

کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

سیاسی نظام میں بھی اقبال بعض نظریات میں نیطشے کے ہم خیال ہیں، مثلاً نیطشے کی طرح وہ بھی اس خیال کے حامی ہیں کہ ملت کی تشکیل ایک مافوق البشر ہستی کی رہنمائی اور رہبری سے ہو سکتی ہے، عوام الناس اس لائق نہیں کہ اپنی رہنمائی آپ کر سکیں،

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

نیطشے کے نزدیک اس ہستی کے مخصوص اوصاف جباری اور قہاری کے علاوہ اور کچھ نہیں، اقبال کے نزدیک ایسی بلند ہستی ان اوصاف کے علاوہ کچھ ایسے اوصاف بھی رکھتی ہے جو سیاسی نظام کو ہی برقرار رکھنے کے ضامن نہیں ہوتے، بلکہ اُن سے معاشرتی اور مذہبی نظام کو بھی تقویت پہنچتی ہے، مثلاً کہتے ہیں،

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

(ضرب کلیم)

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

اس کا انداز نظر اپنے زمانہ سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیران طریق

(ضرب کلیم)

زندہ دل سے نہیں پوشیدہ ضمیر تقدیر
خواب میں دیکھتا ہے عالم نو کی تصویر

دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

وہ اس بات میں بھی نیطشے کے ہم خیال ہیں کہ کمزور کو زندہ رہنے کا حق ہی نہیں ہے، مثلاً کہتے ہیں :-

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

جو دونی فطرت سے نہیں لائق پرواز
اس مرغک بیچارہ کا انجام ہے افتاد

اخلاق میں بھی اقبال کسی حد تک نیطشے کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں، مثلاً نیطشے کی طرح اُن کا بھی یہ خیال ہے کہ جو فعل توانائی، طاقت، اور خودی کی پرورش کرتا ہو، وہ خوب ہے، جو فعل اس کے برعکس کمزوری، دوں ہمتی، اور غلامی کا موجب ہو، وہ ناخوب ہے،

خوب زشت است اگر پنجۂ گیرات شکست
زشت خوب است اگر تاب و توان تو فزود

یہاں تک اقبال نیطشے کے پیرو کہے جا سکتے ہیں، لیکن نیطشے نے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، مذہب کی بھی

تخریب کی تھی، اس کا خیال تھا کہ مذہب ایک لایعنی اور بے معنی نظام فکر و عمل ہے، تقریباً تمام مذاہب خدا کے وجود کا اقرار کرتے ہیں لیکن اس اقرار کی وجہ سے انسان اپنے وجود کی اہمیت کو بھول جاتا ہے، اور تقدیر یا مشیت کے پھندے میں پھنسکر یا تو وہ تمام زور خودی سے عاری ہو جاتا ہے یا نفس کشی اور ترک لذت کے چکر میں پڑکر رہبانیت کی طرح دنیوی لذات اور خواہشات کی راہبانہ نفرت کی تلقین کرنے لگتا ہے، اس طرح انسان اپنی خودی سے دور ہوتا چلا جاتا ہے، اور بالآخر اُس سے یکسر محروم ہو جاتا ہے،

اقبال مذہب کی تردید میں کسی طرح بھی نیطشے کے ہم خیال نہیں ہیں، اُن کا خیال ہے (اور شاید نیطشے خود اس کا اعتراف کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے) کہ نیطشے کے تمام اعتراضات صرف اس مذہب کے خلاف سمجھے ہیں، جس کا نام عیسائیت ہے، دنیا میں ایک ایسا مذہب بھی آیا ہے، جو نیطشے کے فلسفہ کی تائید کرتا ہے، اور جو خودی کی نفی کرنے کے بجائے اس کی تائید کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے، یہ مذہب اسلام ہے،

اس سلسلہ میں اقبال وہ تمام روایات جو فلسفہ خودی کی تردید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، یا تو یکسر اسلام سے خارج کر دیتے ہیں، یا ان کی ایسی مجتہدانہ تاویل کرتے ہیں کہ فلسفہ خودی اور اسلام میں ہم آہنگی نظر آنے لگتی ہے، یہ ہم آہنگی دو طرح سے قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ایک یہ کہ خودی کے مفہوم کی تجدید کی جائے، اس کوشش میں فشتے، ہیجیل، وارڈ، میک ٹیگرٹ اور رومی، اقبال کے لئے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں، اور اُن میں سب سے اہم رہنمائی میک ٹیگرٹ اور رومی کی ہے، آئندہ مضمون میں ان سب کے خیالات سے اقبال کی تعلیمات کا موازنہ کیا جائے گا، اور اس وقت یہ نکتہ پوری طرح سے واضح ہو جائے گا، دوسرے یہ کہ اسلام کو جدید طریقہ سے پیش کیا جائے، اور مخصوص اسلامی نظریات کی تجدید کیجائے، اس کوشش میں پیر رومی اقبال کے لئے سب سے بڑے رہبر اور رہنما ہیں، اقبال اور رومی کا موازنہ انشاء اللہ العزیز ان مضامین کے سلسلہ کی آخری کڑی ہوگی، اور اس میں ہمارا یہ جرأت آمیز دعویٰ پایۂ ثبوت تک پہونچ سکے گا کہ اقبال کے مخصوص فلسفہ کی تعمیر میں رومی کے اثر کو سب سے شروع میں رکھنے کے بجائے سب سے آخر میں رکھنا چاہئے،

کرم خان رامپوری اور انکا کلام

از

جناب محمد علی خان صاحب اثرؔ رامپوری

میں ایک دن رامپور کے سرکاری کتابخانے میں شاہ نصیر دہلوی کا غیر مطبوعہ کلام دیکھنے کی غرض سے فہرست مخطوطاتِ نظم اردو کی ورق گردانی کر رہا تھا، حسن اتفاق کہ اس سلسلہ میں میری نظر "کلیاتِ کرم خان رامپوری" پر بھی پڑ گئی، اور اس کے ساتھ ہی کرم خان کا باغ بھی یاد آگیا، چنانچہ کلیات منگا کر دیکھا تو دلچسپی بڑھنا شروع ہوئی، خصوصاً جب اُن کے صنعتی کلام کو دیکھا تو ان کی قدر میں اور بھی اضافہ ہوا، اور یہ ثابت ہوا کہ ان کے بھانجے احمد خانزادے غفلت تخلص نے کرم خان کو "خسرو ثانی" کا خطاب کچھ سمجھ کر دیا، ان میری تحقیقات کی ابتدا امیر مینائی کی انتخاب یادگار سے ہوئی جس میں کرم خان کو ان الفاظ سے یاد کیا گیا ہے، "کریم اللہ خان کرم تخلص عرف مرزا کھنو باشندہ رامپور معصوم صفت تیز طبیعت صاحب ذوق شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق (شاگرد قائم چاندپوری) اپنے عہد میں بڑے نامور تھے، دور دور تک مشہور تھے، ۶۰ برس کی عمر پائی، مرض ضیق سے تنگ آکر ۸ ذی الحجہ کو دوشنبہ کے دن وقت ظہر ۱۲۵۲ھ (مطابق ۱۸۳۶ء) میں رحلت فرمائی،"

جارج فانتوم فرانسیسی شاعر اردو نے اپنے قلمی تذکرہ شعرائے رامپور میں (جو کتابخانے میں محفوظ ہے) یہ رائے ظاہر کی ہے کہ

"از علم بہرۂ وافی نداشت مگر شعر اردو خوب می گفت"

ان کا ذکر مصحفی نے تذکرۂ ریاض الفصحا میں، عبدالغفور نساخ نے تذکرۂ سخن شعرا میں اور عبدالحی

بدایونی نے تذکرہ شمیم سخن مین مختصراً کیا ہے، نساخ نے صاحب دیوان ہونے پر بھی روشنی ڈالی ہے لیکن ان کا جو کلام انتخاب یادگار مین چھپا ہے، اس کے اشعار کی کل تعداد صرف ۱۰ ہے، اور ریاض الفصحا مین صرف ۲ شعر چھپے ہین،

یہ دیکھکر صدمہ ہوا کہ کرم خان کا کلام ایک سو پندرہ برس سے گمنامی کے گوشہ مین دفن ہونے کے باوجود بزبان حال اس شعر کو بار بار دہرا رہا ہے،

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یہ مانا کہ اُن کا کلام دلی اور لکھنؤ وغیرہ کے مشاعرون کی داد کے بعد بے نیاز ستایش ہے لیکن اس ادبی یادگار کو جو عام کیا خاص نگاہون سے بھی اب تک مخفی رہی منظر عام پر لانا ضروری ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس دور کی زبان مین آج کی زبان سے کہان تک ہم آہنگی ہے،

افسوس یہ ہے کہ آج اُن کے وطن مین بھی انھین کوئی شخص بحیثیت شاعر نہین جانتا، صرف کرم خان کے باغ کے ذریعہ وہ لوگون مین مشہور ہین، لیکن اب یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا، کیونکہ یہ باغ جو اب انگوری باغ کہلاتا ہے، کرم خان رزڑ کا تھا، جو سکرتال کی جنگ مین شوال ۱۱۸۵ھ مین مقتول ہو کر اسی باغ مین دفن ہوئے ہین،

کرم خان کے کچھ حالات نصرت یار خان صاحب رزڑ عمر ۷۰ سال سے ان کے ماموں یعقوب علی خان صاحب کے ذریعہ اتنے ہی معلوم ہو سکے کہ وہ مہاراجہ ہلکر کی فوج مین ملازم تھے، اور اُن کے ساتھ ان کے بھتیجے نتھو خان رزڑ بھی تھے، اُن کی صرف ایک بیٹی تھی، جو لا ولد فوت ہوئی، ایک بچہ پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا، دوسرے بچہ کا بچپن ارمان ہی رہا، اس وقت کرم خان کے بھانجے احمد خان، خونزادہ نعمت المتوفی ۱۲۵۵ھ کا قطعہ تاریخ سن لیجئے، اس کے بعد کچھ حالات خود کرم خان اپنے اشعار مین بتا گئے،

شاعر کامل و ذی حوصلہ ماموں صاحب جن کو استاد کرم خان کہے اعلیٰ ادنیٰ
متخلص بہ کرم، نام کریم اللہ خان مجمع خوبی و اہل ہنر و شرم و حیا
ایک استاد کے شاگرد تھے ہم وہ دونون تھا اس آفاق مین فن کا برابر شہرا
مرض ضیق کی تکلیف اٹھائی دو سال شصت و یک سال تلک کھائی ہوائے دنیا
آخر اس کو بھی نہ خوش یان کی اقامت آئی تا ابد کوئی جہان مین نہ رہے گا نہ رہا
سوئے اقلیم بقا ملک فنا سے جس دم وہ سخن فہم جہان، رخت سفر باندھ اٹھا
ظہر و یک شنبہ و ہفتم مہ ذی الحجہ کی تھی کتنے بھاگن تھے اسے ہند مین پیر و برنا
طلب اس خسرو ثانی نے کیا سال جو حال آئی ہاتف کی یہ آواز "کرم خوش فکر بود"
۱۲۵۴ھ

کرم خان کے شاگردون مین صاحبزادہ اشرف علی خان رامپوری المتوفی ۱۳۱۰ھ نبیرۂ نواب سید محمد فیض اللہ خان بہادر بانی رامپور، اور صاحبزادہ غلام حضرت خان المتوفی ۱۳۰۷ھ ابن صاحبزادہ احمد یار خان افسر تخلص خاص شہرت رکھتے تھے،

ان کا کلام میری رائے مین بہت صاف رواں، عربی اور فارسی کی ترکیبون سے پاک، دلچسپ اور عام فہم ہے، جو شاعرون کی فضا مین سر سبزی کی کافی صلاحیت رکھتا تھا، اگرچہ متروکات کو جو اس دور مین رائج تھے، چھوڑ دیا جائے تو اُن کی زبان آج کل کی زبان سے تقریباً ملتی جلتی ہے، ان کے کلام کی خوبی اُن کے صفحتی شعرون سے ظاہر ہوتی ہے، جس مین بڑی دماغ سوزی سے کام لیا گیا ہے، اور مضمون آفرینی کے جوہر دکھائے گئے ہین، وہ بھی اپنے ہم عصر شاہ نصیر دہلوی کی طرح مشکل زمینون مین شعر کہتے تھے، اُن کے کلام مین سراپا نگاری،...... روانیت، روزمرہ، محاورہ، ادابندی، مضامین کی ندرت اور آسان تشبیہات و استعارات سب کچھ موجود ہین، جارج فانوتم صاحب تخلص نے بھی ان کے اردو کلام کی تعریف کی ہے، علمی قابلیت کو کم ظاہر کیا ہے، جو زیادہ وقعت نہین رکھتا، اُن کے کلام کا نمونہ خود اس مسئلہ کو حل

کردے گا، ان کو فارسی مین بھی دسترس تھی جس کا شاہد ان کا فارسی کلام ہے، عروض اور فنِ شعر سے بخوبی واقف

تھے، طبیعت رسا تھی، مولوی مشہور تھے، خود کہتے ہین،

ین ر دیکھا اُن سے تو مجھ کو وہ یون کہہ کہہ ستاتے تھے

مرا اُستاد، میرا مولوی، میرا کرم خان ہے

کرم خان پٹھان تھے، امیر مینائی نے اُن کا عرف مرزا لکھا ہے، جس کا تعلق قومیت سے نہین

بلکہ یہ نام اُن کے کسی وصف یا عادت و ذہنیت کی وجہ سے کسی نے رکھدیا ہوگا، جو مشہور ہو گیا، اور

غفلت اور دوسرے تذکرہ نویسون نے کہیں اس کا ذکر نہین کیا،

اُن کے کلیات مین ۲۹۵ غزلین اور ۶۲ فرد مطلع ہین، ۲۵ رُباعیان، ۱۳ تاریخین، ۳ ہجوین

(ہجو نومشقانِ سخن، ہجو فاحشہ عورت، ہجو شیخ نہال میجر پلٹنی) ایک مخمس در خلل در ترجیع، پانچ ...

(۴ شعر) (۳۶ شعر) (۶ بند)

مثنوی سوداگر بچہ و وزیر زادی، ایک اور مثنوی متعلق قیافہ شناسی، مثنوی در مدح دلیر خان، مثنوی

(۲۲۰ شعر) (۵۵ شعر) (۶۰ شعر) (۲۵ ...

مثنوی بزبان فارسی در مدح راجہ دھرم داس ان کے علاوہ قطعات بھی کثیر ہین،

اب آپ پہلے اُن کے صنعتی کلام کے چند نمونے ملاحظہ فرمائین جن کی وجہ سے کرم خان کے

غفلت نے انھین خسروِ ثانی کا لقب دیا ہے،

غزل کے ۵ شعرون ہی سے نمونۃً ۳ شعر جس کے پڑھنے مین لب نہین ملتے،

کل تری راہ دیکھتے ہی رہے — سوے در آہ دیکھتے ہی رہے

لگ گیا آکے یان گلے سے کوئی — لوگ ناگاہ دیکھتے ہی رہے

دیدۂ دل سے شانِ حق ہر جا — اللہ اللہ دیکھتے ہی رہے

غزل در صنعت تسامح ثلثہ | اس غزل مین صنعت تحال گئی ہے کہ اگر پہلا مطلع چھوڑ دین، اور صرف پہلے مصرع کو پڑھین

تو دوسری غزل ہو جائیگی، اور پہلے مصرع کے علاوہ دوسرے مصرعے کو پڑھین، تو پانچ مطلع اور ہو جائین گے،

خندۂ لب ہی ہو اُس کے شمع خندان بے فروغ	جلوۂ دندان سے ہو سود چراغان بے فروغ
۱ نورِ بینائی ہے، اگر زلفِ بتِ گلفام سے	ہو اندھیری رات مین شمعِ شبستان بے فروغ ۱
نشاتا ہے چراغِ خانہ اپنا شام سے	ہو سواد خط مین یعنی روے جانان بے فروغ
۲ جون امام سجہ کہئے مجھ کو سو کا پیشوا	جون تو مین دانا پہ ہون پیشِ نریمان بے فروغ ۲
گرچہ مین گنتی سے باہر ہون پہ ہون امام سے	جون چراغِ کشتۂ گورِ غریبان بے فروغ
۳ ہین نہ ہو روزن سے ہماری اسکی کتوری یاد	وصل کی شب مین بھی نجم بخت ہے یان بے فروغ ۳
کام ڈالا ہے خدا نے کس بتِ خود کام سے	ہو شرارت سے وہ کافر و دیدامان بے فروغ
۴ لگ گئی ہین اس مریضِ غم کی آنکھین چھت کو آج	ہو وہ نورِ دیدہ اک گوشہ مین پنہان بے فروغ ۴
دیکھ کر [illegible] اس کی [illegible] بام سے	مردمِ چشم اپنے ہی یان زیر ایوان بے فروغ
۵ کیا ہو [illegible] وہ شوخ	خجلتِ دشنام سے ہو روے انسان بے فروغ ۵
اے کرم وہ [illegible] کھی ہو اس نے شام سے	اچپلاہٹ سے ہو اس کی برقِ رخشان بے فروغ

غزل مشتمل بر صنعت مقلوب مستوی

روزیہ بارش و شراب بے زور — روشنی مراد و دار ین شود

آج یہ کونا دوا نو کہی جا — روز دو ردج دید حد دو زور

زور فال دقیق دل افروز — روش مے ہمہ ہمہ یم شود

آہ یہ داغ دو رہ دغا رہے ہا — روگ یارب یہ ہے براے گور

اہاہا - اہاہا - ہاہا — روہی دن ایک باندی ہور

تین مختلف المضامین کے مصرعون کے جواب مین ایک مصرع

نے سراب لی، کھاکے گلوری لیلے؛ گائی جانا گوری،

(محبوبہ) (معلوم ہوا) (نام راگنی)

دودھ بھر، پی جام بلوری بے بے، گائے جا، ناگوری

شازش کیجے، چوری چوری نے نے، گائے جانا، گوری، (نام شہر) (خوبصورت عورت)

غزل کے ۵ شعرون مین سے نمونۃً ایسے دو شعر جن کا ہر حرف نقطہ دار ہے،

خفتن شب جبین، شیفتہ جبین، شب جبین، جی نے تین بجیز جبین

بت بنی بج زشت بخت شقی بت بنی بیش تخت، تخت نشین،

غزل کے ۵ شعرون مین سے نمونۃً ایسے ۲ شعر جن کا ہر حرف بغیر نقطے کا ہے،

گور کا دکھ ہراس ہوا گاہ کہہ دلا لا الہ الا اللہ

آدھا درہو گر سلگ کر دل آگ لگ کر ہو راکھ کوہ اور کاہ

غزل در صنعت الفاظ متحد و معانی مختلفہ تمام اشعار،

نہ وہ پہنچا نہ کل آئی، ہے ہات نہ وہ پہنچا نہ کل آئی ہیہات

(عضو) (کلائی) (ہاتھ) (آیا) (چین) (افسوس)

برسی کیون جانے ہے، رہ رہ برسات برسے کیون جانے ہے رہ رہ، رہبر سات

بول میٹھا تو سنا جائے، نبات بول میٹھا تو سنا جائے نبات (پہلو)

آپ بس جائین، نہ گھر ہو، ہارات (نہ بات) آپ بس جائین نہ گھر ہو بارات (بجائے معصری)

(ٹھہرین) (تاراج یعنی گھر نہ لٹے) جب تک رات رہے

کہہ کرم سے وہ بسا دے دے ہات کہہ کرم سے وہ بسا دے دیہات

بس آدے، ہاتھ دے یعنی ہات لائے مہربانی آباد کرے دیہات

صنعت تصریح الکنایہ :-

کونسا زیور ترا زیب گلو ہے جب کہا تو وہ ہنس لی دور کر برقع رخ پر نور سے

ہنسلی. (زیور)

جب کہا کیا کھائے گا، پاؤن آگے کرد ئو یعنی پاپڑ، ہاتھ کھینچا کس فریب زور سے

(پاپڑ)

بعد مرون کیا چڑھاؤ گے جو پوچھا قبر پر شمع گل کی، پھیر کر منہ عاشق رنجور سے

گل (پھول)

جب کہا اُس سیمبر سے تم پہ کیا صدقے کرین پیش رو، پا کر کے سمجھایا نئے دستور سے

روپا (روپیہ)

جب کہ پوچھا اس غزل کا ہے کرم کی کیا صلہ سوت کے دس تار توڑے اور جوڑے دور سے

(دستار)

۵ معمون مین سے دو معمے ملاحظہ ہون،

دم اٹکا ہے سینے مین اب یہ رنجور مسافر ہے یسین میں پڑھواؤ کوئی حرف فنا جو آخر ہے،

اس شعر سے لفظ "یوسف" نکلتا ہے، جس کے اشارے مصرعہ ثانی مین موجود ہین، یعنی "ی" اور "س" کے درمیان واؤ اور آخر مین "ف" ہونے سے یوسف ہو جائے گا،

سادہ دلی سے گر صاحب، کو میری تخلص کی ہو طلب پھینکو کلاہ مکر کو زیر پا یہ لطیفہ مشہور ہے،

کلاہ مکر میم ہوئی، اوس کو لفظ گر کے آخر مین لانے سے کرم ہو گیا، جو شاعر کا تخلص ہے،

ہندی پہیلیان،

(استرا) کالے پہاڑ پر ملا ناچے، مورکھ میری پہیلی نہ بوجھے لال چھڑی میدان کھڑی کوئی باداجی کی جلیبی نہ بوجھے (شکرقندی)

کالا ڈالون، لال نکالون، اکڑون بیٹھ پٹاپٹ   کیلنے مین اُس رشک پری کا آبیری یہ پہیلی نہ بوجھے

(لوہا)

ساری جنگل آدھی بستی، آدھی ڈھنگی، ساری ہستی   بلبل جانے اُس کے جو بوجھے نرگس بوجھ پہیلی بوجھے
نیم جل

(بلبل)

چھیل چھبیلے لب کو نہ کھولے، منہ لگاؤ منھ سے نہ بولے   اک انگلی کا اشارہ پا دے سب کو میٹھے بول سنائے

(خنگ از قسم بٹیر)

اک رنڈی سو سوجل کھاوے، دار دپی کر شور مچاوے   پھولی جائے مین نہ سماوے دوڑی آوے دوڑی جاوے

(چھچھوندر)

اک باکی پھرتی ہر گھر گھر، پاؤن نہین دھرتی ہے زمین پر   جس کے ہاتھ لگ اس کی آدر انگلیون پر وہ اسکو نچاوے

(پھرکی)

بھانتی کا سانگ دکھاوے نخلے مین اک پیڑ جماوے   پھول آوے پھل اس مین نہ آوے چھاؤن کسی کو آگ نہ بجھاوے

(آتش بازی کا انار)

غزل کی پہیلی

اس شکر لب سے کیا جب کہ طلب بوسۂ لب   دینے ٹھہرائے بانداز عجب بوسۂ لب
نیشکر تین اور اک تیغ مجھے دے کے کہا   شرط پوری کرو، ہم دیوین گے تب بوسۂ لب
تین چوٹون مین غرض انکے کرو نو ٹکڑے   دیوے دانائی، ملاوے نہین اب بوسۂ لب
نہ ہے ایک اکیلا نہ پڑے ایک پہ چوٹ   یہ بھی ہے قید اگر مانگو جواب بوسۂ لب
اس کی یہ شرط بجا لا کے کرم ہم نے لئے   پے بہ پے بوسۂ لب بوسۂ لب بوسۂ لب

اگر تینون نیشکر کو مثلث رکھا جائے، تو تین ضربون مین نو ٹکڑے ہوتے ہین،

ضرب اول

صنعتِ ایہام:-

سونے کا اک چھپرکھٹ بچھا ہو میری گھر مین   ترسون ہون وصل کو تین اور دلربا ہے بر مین

(صحرا و جنگل)

اے مست ناز مجھکو سوگند تیرے سر کی   دیکھا ہے پگڑی باندھے اک فیل رہگذر مین

چوتھے مصرع سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہاتھی کو پگڑی باندھے دیکھا ہے، حالانکہ شاعر کا یہ مقصد ہے کہ ایسی حالت مین جب کہ وہ پگڑی باندھے ہوئے تھا، اوس نے ایک ہاتھی کو راستے مین دیکھا،

حضرت امیر خسرو نے فردوسی کے اس شعر کے پیشِ نظر جس مین نقارے کی آواز کو دوسرے مصرع مین ظاہر کیا گیا ہے،

زنقارہ آواز آمد برون   کہ دون است دون است گردونِ دون

اپنا شعر ڈھول کی آواز مین پیش کیا ہے، جس کے دوسرے مصرع کے الفاظ سے ڈھول کی آواز پیدا ہوتی ہے،

دہل زن، دہل زد، بتحسین او   کہ دین دینِ او دین او دینِ او

ان اشعار کا خیال کرکے کرم خان کو بھی طبع آزمائی کے لئے کچھ سوچنا پڑا، نقارہ، اور ڈھول کے لئے تو کوئی گنجایش ہی نہین تھی، مجبوراً برات کے تاشون کو جن سے انھین دلچسپی بھی تھی، منتخب کرلیا، فرق اتنا ہی رہا کہ وہان بامعنی الفاظ سے آواز پیدا کی گئی تھی، یہان صرف آواز کے بولون پر ہی اکتفا کی گئی،

فیل پر رسوائی کے بٹھا ساتھ لیا انبوہِ ملامت   گشت کے قابل پایا اربع عنصر کا بازا چوڑا،
لے کے چلا دلہن کو کرم با نالۂ افغان کے باجے   کڑاکڑ کڑاکڑ جھنکڑ جھنکڑ، کڑاکڑ کڑاکڑ جھنکڑ جھنکڑ

ایک ہی قافیہ کی غزل کے چند اشعار:-

جام دے ساقی آج بدلی ہے
خو ہماری بھی آج بدلی ہے

بیٹھتے ہو بدون کی صحبت مین
آہ تم نے یہ چال بدلی ہے

ہم سے چو پڑ دہ کھیلتے ہین کرم
بوسہ بوسہ کی بازی بدلی ہے

نامہ در تلمیح شطرنج بشطرنجباز :-

عزیز من شہِ اقلیم خلقت
بساطِ دہر پر رہیو سلامت

یہ شوق دیدِ رُخ ہی میرے دل میں
پیادہ پا ہون حاضر بندگی مین

مرے دن مین اور نہ پوچھو تم مرا حال
شہِ خوبان سکھائی کس نے یہ چال

کیا اُنکون نے زبِ آورد ہ لی خاک
بکشت دل تو دریا بُرد، مت تاک

دو شے رُخ آپ کا ہی بندہ پرور
کہ یان مرتے ہین صحب الفیل رُخ پر

مین جان بازی مین قائم ہون نہین در
لیا کیون اے سوار اسپ رُخ پھیر

دعا ہے دوستان پر چال ہے کر
کرم لب ہاے فرزین سے بہتر

غزل در صنعت لزوم مالا یلزم :-

پردہ پردہ ایما ہی، اور ایما ایما حکمت ہی
چوری چوری بوسہ ہے اور بوسہ بوسہ لذت ہے

پردہ دری سے درد دل کی سخت ندامت حاصل ہے
ساعت ساعت نالہ ہی اور نالہ نالہ خفت ہی

دیکھ کے صورت اس کا فر کی مردم دیدہ کی صورت
گوشہ گوشہ مردم ہے، اور مردم مردم حیرت ہی

اپنے کلام پر صنعت پر اوچھے اتراتے ہین کرم
بستی بستی شاعر ہے اور شاعر شاعر صنعت ہی

صنعت ایہام :-

اشراف ہی سے اب تو خرافات ہین سرزد
ہم نے شرافت کو شرافت سے نکالا

حرمت کرو بندی کو گو حرمت رہے اسکی
گو کہنے کو ہو بات کہ حرمت سے نکالا

آزاد

مشکل زمینون کی چند غزلون کے کچھ اشعار :-

حق ہی بے چون و چگون واندرون و تحت و فوق
ظاہر و باطن برون و اندرون و تحت و فوق

جلی ہے آہ سے یان دل کے داغ کی بتی
ہوا سے ہوتی ہی گو گل چراغ کی بتی

ہوا توجہ مرشد سے دل مرا روشن
گو یا یہ ہے رہ حق کے سراغ کی بتی

جو سیر و سفر کرتے ہین وہ جاری ہین موجین
جون بحر نہ ہو جوش مین تالاب کا پانی

یون رنج مین ہین ہم چمن دہر مین جیسے
ٹھوڑی پہ ہو فوارہ پر آب کا پانی

نقشِ قدم یار کے بوسے سے نہ ہو زلیت
کچھ سانپ نہیں ہم کہ جئیں چاٹ کے مٹی

سم ہے ترے ہر بال مین کاکل کی قسم ہی
قطرات عرق زلف مین ہین سانپ کے انڈے

وہ شدت گرما ہجران آہون سے کہ پھوڑے
چھیلون نے بھی گرمی سے کرم سانپ کے انڈے

بینی پہ عرق ہے تری یا نور کی بوندین
ڈھل آئی ہین ماتھے سے برس ناک پہ سیدھی

دم مارے کرم کب کوئی اس سنگ زمین مین
تلوار یہان گرتی ہی ہے، بس ناک پہ سیدھی

شب ہجر مین تن مردہ کو مری جان یا تو مسیح ہی
کے لب پہ لب جو دہر کے تم لگے بجنے نوبت صبح اب

وہی شہسوار یہ ہو دے گا کہ نگاہ آنے کو کہہ گیا
ہوئی یار دل کے صدا سے سم لگی بجنے نوبت صبح اب

خط آگیا تو وہ طفلی کے غم سے ہے خاموش
اب اس کے لب پہ ہین مہر سکوت موے بروت

پدر کے نام کو روشن کیا وہ شاعر ہون
رکھے ہون نانے ہو ئین سپوت موے بروت

نہ ہون کب اہل حیا امتیاز سے بھاری
کہ آنکھ لاج کی ہے، کچھ جہاز سے بھاری

کرم کسی سے نہ کہہ حال دل جو چاہو وفا
کہ آدمی تو ہے اخفاے راز سے بھاری

دو دانا ران ہو جیسے گم کی کوئی اک سخن تھا
جو ہم کرتا مین طوفان دیدۂ نمناک سے نکھ

فرقدان سے بڑے دو چمکے ہین موتی اس مین
ہے فزون رتبے مین کچھ انجم افلاک سے نکھ

یون تن زار مین میری نہین اک بوند لہو   جیسے کانٹے سے نکلتا نہین خون رگ پان

لب پان خوردہ کے تیرے ہین مرے دل پہ زخم   اور شتے سے نہ ٹانکا ان کو بدون رگ پان

حکم کرین گو قبر مری پاٹ کے مٹی   پر اشک بہا دیوین مری کاٹ کے مٹی

بقرہ کیجیو تعمیر ہمارا پس مرگ   لاکے اس اہل تجمل کی گلی کی مٹی

خانۂ گور کو سمجھون مین کرم باغ ارم   گر نصیبون مین ہو اس گل کی گلی کی مٹی

تن لاغر ہے مرا سب کی نظر مین تنکا   کاہش قدر سے ہون چشم بشر کا تنکا

اس کے مژگان کے تصور مین بھر آئے آنسو   کیون نہ آنکھوں کو لگن نکلے ہر ان مین تنکا

ترے نشان قدم دیکھ دیکھ گھستے ہین   قدم قدم پہ ہم اے مہ جبین، زمین پہ جبین

کرم کسی سے نہ ایسی غزل ہوئی ہرگز   رگڑ رگڑ کے موئے نکتہ چین زمین پہ جبین

کاہ کو جون کہربا کھینچے ہوائے مطرب بچہ   لے گیا یون دل کو تیرا نغمۂ و بربط گھسیٹ

ہے شوق ہم آغوشی یہ عاشق، دونوں کو   دو ہاتھ کفن سے بھی جا در کے رہے باہر

نکلے تھے سفر کو ہم کیا نحس گھڑی ایسے   آئے نہ کرم گھر کو اور مر کے رہے باہر

ادعائے کمال فن:۔

تونے کیا کیا اس کے باندھے مضامین اے کرم   سُن کے جن کو پڑ گئی ہے طالب آملی پاوس

کیون نہ شاعر ہون کرم میری زبان کے تئی   حضرت شوق نے یہ طرز مجھے سکھلا دی

باندھ لاتا ہون مین شعرون مین کرم بات نئی   آفرین اس لئے کرتے ہین سخندان مجھ کو

اے کرم گو مجھ کو دعوائے سخن گوئی نہین   بندھ رہی شاعرون مین پہ مری اک دھاک سی

جذبات عالیہ:۔

تمہین تو ایک جدائی کا میری رونا ہے   مرے جگر کو مرا ہو کہ مجھ سے سب ہین جدا

نہ مجھو دور ہین تم، اگرچہ اب ہین جدا،   کہ جب دلون ہی سے نزدیک ہین تو کب ہین جدا

منعم کرلو جہان مین اب سخاوت خوب سی   تم جدھر سے آئے ہو جاوگے ادھر ہاتھ جھاڑ

کرو نصف اب مانگ کر اک حصہ لگا دیجو بانٹ   یعنی جو دھن دیکھے جاتا تو آدھا دیجے بانٹ

کسی کا کوچ ہے یان اور کسی کا یان یہ ڈیرا ہے   یہ دنیا فی الحقیقت اک سرا کا سا بسیرا ہے

برنگ صبح گو مہمان ہون دنیا مین کوئی دم کا   سفر لیکن کرونگا دیکھ اس مہر درخشان کو

چمن مین دہر کے مین خار ہون عالم کی آنکھون مین   بچا کر ہر کوئی چلتا ہے مجھ سے اپنے دامان کو

مری شام غم تو سیاہ ہے یہ وہ نور بخش نگاہ ہے   مجھے کیا ہی حق نے دیا ہے اب یہ چراغ اس شب تار مین

مجھے رنج و خواری و خرمی ہوئی باغ دہر مین ایک سی   کھلے جب کہ دیدۂ معنوی وہی گل مین ہے وہی خار مین

کرم اپنے پر کر و رحمت، وہ ہے غرق بحر معصیت   گئی ڈوب احمد مجتبےٰ مری ناؤ ان کے دھار مین

چومتا نقش قدم اس کے چلا جاؤن مین   یہ بتا دو کہ وہ کس راہ گذر سے نکلا

نثار ہین اسی اُمی لقب پہ ہم جس کے   لکھی ہین وصف مین آیات حق ورق بہ ورق

مثنوی سوداگر بچہ و وزیرزادی کے چند ابتدائی اشعار متعلق حمد و نعت:۔

ہے جناب حق مین برحق سجدہ ساز   نیک گوہر ناز پرور و نیاز

خاک سے کی جس نے مردم کی بنا   دیدۂ مردم مین دی انسان کو جا

صورت تجنیس لفظی جابجا   رکھے ہر صورت مین اک معنی جدا

کرکے نور اپنے سے مشتق میم حسن   احمد مرسل پہ کی تقسیم حسن

اس سے یہ خوبان ہین رشک شب چراغ   ہر چراغ اک جس سے روشن ہے چراغ

مجمع الانوار یار اس کے لئے   بزم دین کے کر دیئے روشن دیئے

مثنوی قیافہ شناسی کے ابتدائی اشعار حمد و نعت:۔

حمد ہی اس کو ہے قیافہ شناس | جس نے کہ بخشے ہمین ہوش و حواس
حمد خدا غایتِ نطق و بیان | ورنہ ہین ہم شکل زبان و زیان
ہووے اگر شکر سے شکر شکن | نام اسی لب کا ہے شیرین سخن
نام خدا ہوشہ جو وردِ زبان | کام نہ ہو بند پھر اس کا یہان
ذکر سے اس کے جو دہن دور ہے | آہ وہ گویا دہن گور ہے
صنعِ الٰہی سے ہے نورِ نظر | اس کو نہ دیکھے تو ہے وہ بے بصر
یاد سے اس کی جو نہین دل مین نور | اس سے تو بہتر ہے یہان سنگِ طور
بعد ثنا شکر کے زیبِ کلام | نعت محمدؐ ہے علیہ السلام
ہادی کونین شہ انبیاء | سیدِ عالم سندِ اولیاء
باعثِ ایجاد و شفیعِ امم | رونقِ طیبہ و طرازِ حرم
رحمتِ حق، مردمِ چشمِ وفا | صیقلِ آئینۂ اہلِ صفا
محرمِ اسرارِ حریمِ الٰہ | قبلۂ حاجات رسالت پناہ
زیب دہ نقش و نگارِ جہان | تازگیِ باغ و بہارِ جہان
صاحبِ معراج و براق و علم | حادث و موصوف بحسنِ قدم
عاشق و معشوق خدائے کریم | مظہرِ حق ناظرِ حسنِ قدیم
کانِ حیا معدنِ جود و سخا | شمسِ ضحیٰ بدرِ دجیٰ مصطفیٰ

رحمتِ حق اُس پہ اور احباب پر
آل پہ اور سائر اصحاب پر

(باقی)

مضمون "دہلی اردو اخبار"

مندرجہ اسلامک کلچر کی ٹائپ کی کچھ غلطیان

از

جناب مرزا صادق صاحب

اخبارات عموماً دبیز کاغذ پر نہین چھپتے، اور مطالعہ کے بعد یا تو ضائع ہوجاتے ہین یا بنیون کی دوکان مین پڑیان بنانے کے کام مین آتے ہین، ایسے لوگ خال خال ہین، جو اُن کے فائل رکھتے ہین لیکن فائل بھی عموماً کچھ تو کاغذ کی خرابی، کچھ دیمک کی دستبرد اور کچھ دیگر اسباب سے رفتہ رفتہ ضائع ہوتے رہتے ہین، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جیسے جیسے زمانہ گذرتا ہے، پُرانے اخبارات کے فائل کمیاب یا نایاب ہوتے جاتے ہین، چنانچہ غدر سے قبل کے اخبارات کے فائل اب نہین ملتے، جو مل جاتے ہین، اُن کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معلومات اور اطلاعات کا خزانہ ہین، جو شخص اس زمانہ کی سیاسی، تمدنی یا لسانی تاریخ مرتب کرنا چاہے، اس کے لئے پرانے اخبارات کے فائلون کا مطالعہ لازم ہے،

بعض اہلِ قلم نے بعض پرانے اخبارات و رسائل کے فائلون یا متفرق پرچون کا مطالعہ کرکے نہایت دلچسپ، پراز معلومات اور مفید مضامین سپرد قلم کئے ہین، ان مین سے چند جو میرے علم مین ہین، حسب ذیل ہین:-

۱- پنڈت دتا تریا کیفی نے محبِ ہند، دہلی کے بارے مین ایک مقالہ رسالہ ادبی دنیا [illegible] مین لکھا،

(۲) موصوف ہی نے "کوہ نور" لاہور پر رسالہ اردو ۱۹۳۵ء مین ایک عالمانہ مضمون تحریر کیا،

(۳) مولوی اظہار الحسن وکیل غازی آباد نے جو اب پاکستان مین جہلم میونسپلٹی کے سکریٹری

ہین "خیر خواہ ہند" دہلی کے بارے مین رسالہ ہندستانی جنوری ۱۹۳۲ء و جولائی ۱۹۳۲ء مین ایک

مفید مقالہ سپرد قلم کیا جس پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اپنے نوٹ کا اضافہ کیا تھا،

(۴) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے "جام جہان نما" کلکتہ کے بارے مین ہندستانی ۴۵-۱۹۴۴ء مین

نہایت ہی فاضلانہ مقالہ لکھا،

انگریزی کے اہل قلم نے بھی اخبارات کے پرانے فائلون سے استفادہ کرکے اس موضوع پر نہایت

اچھے مقالات تحریر کئے ہین ان مین مسٹر ایف اے ایم عبدالعلی، پروفیسر بنرجی، مسٹر سانیال، پروفیسر

اسلم صدیقی، اور مسٹر کے سجن لال کے نام لئے جا سکتے ہین،

ان مین سے مسٹر کے سجن لال کا مضمون بابت "دہلی اردو اخبار" مندرجہ رسالہ اسلامک کلچر نہایت

دلچسپ اور مفید معلومات سے بھرا ہوا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس مین ٹائپ کی کچھ غلطیان رہ گئی

ہین جن کو اگر درست نہ کیا گیا، تو جو لوگ اس مضمون سے استفادہ کرنا چاہین گے، اُن کو تھوڑی

سی زحمت ہوگی، اس لئے اس کی تصحیح کر دینا مناسب معلوم ہوئی،

اصل مضمون پر لکھنے کے قبل ایک امر کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ

اوپر مذکور ہو چکا ہے، پرانے اخبارات کے فائل رفتہ رفتہ ضائع ہوتے جا رہے ہین، اس لئے

اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کا فرض ہے کہ ان فائلون کی حفاظت کرین، مسٹر

کے سجن لال کے پاس جیسا کہ انھون نے لکھا ہے، دہلی اردو اخبار اور بعض دیگر اخبارات کے

فائل ہین، علامہ کیفی کے پاس "کوہ نور" وغیرہ کی جلدین ہین، حمیدیہ لائبریری بھوپال مین دہلی

اخبار کے پرچے محفوظ ہین، امپیریل ریکارڈ آفس مین جام جہان نما کلکتہ کے کچھ پرچے ہین، اگر

انجمن ترقی اردو پاکستان یا ہندوستان ایسے پُرانے فائل حاصل کرکے اپنے کتب خانہ مین رکھ لے تو ان

لوگون کے لئے جو قدیم اخبارات کی تاریخ پر کچھ لکھنا چاہین، بڑی سہولت ہوگی، اور ایسے فائل ان

لوگون کے لئے نہایت مفید ہون گے، جو کسی خاص زمانہ کی سیاسی، تمدنی، یا لسانی تاریخ کو ترتیب دینا

چاہین گے، مین تو یہان تک تجویز کرنے کی جرأت کرون گا، کہ جن اخبارات کے نمونے کمیاب ہین، وہ

بجنسہٖ کتابی صورت مین شائع کر دیئے جائین، اور جن کے فائل زیادہ ضخیم ہون، اُن کے اقتباسات شائع

کئے جا سکتے ہین،

ایک امر زیر بحث یہ ہے کہ جام جہان نما کلکتہ اردو کا سب سے پہلا اخبار تھا یا نہین بعض لوگ امپیریل

ریکارڈ کے فائلون کے مطالعہ سے ایک نتیجہ پر ہوتے ہین، اور بعض دوسرے نتیجہ پر، اس لئے بہتر ہوگا

کہ کل فائل جو غالباً زیادہ ضخیم نہین ہے بجنسہٖ شائع کر دیا جائے،

زیر بحث موضوع کے سجن لال صاحب کا مضمون "دہلی اردو اخبار" جو اسلامک کلچر بابت جنوری ۱۹۵۵ء (جلد ۲۹ نمبر ا)

مین شائع ہوا ہے، مضمون مذکور سے اس اخبار اور اس زمانہ کے واقعات پر جب وہ اخبار جاری تھا کافی روشنی پڑتی

ہے، اور لائق مضمون نگار کے انداز تحریر نے مضمون کو کافی دلچسپ اور مفید بنا دیا ہے، اس مضمون مین ۱۸۵۲ء

کے آٹھ اور ۱۸۵۳ء کے گیارہ پرچون کے حوالے ملتے ہین، ان انیس پرچون سے کافی تاریخی مواد حاصل کیا

جا سکتا ہے، جو ان لوگون کے لئے نہایت مفید ہے جو غدر کے قبل کے اخبارات کی تاریخ سے دلچسپی رکھتے

ہین، سیاسی، تمدنی، اور معاشرتی تاریخ کیلئے بھی ان پرچون مین کافی مواد مل سکتا ہے،

یہ امر مسلّم ہے کہ "دہلی اردو اخبار" ۱۸۳۶ء مین جاری ہوا خود کے سجن لال صاحب کی تحقیق بھی یہی ہے اور

دوسرے اہل قلم کی بھی یہی رائے ہے، لیکن ۱۸۵۲ء کے پرچون کی جلد ۱۴، اور ۱۸۵۳ء کے پرچون کی جلد ۱۵

تحریر ہے، اس حساب سے اجراء کا سال ۱۸۳۹ء ظاہر ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا درمیان مین اخبار

بند ہو گیا تھا، یا اور کسی سبب سے یہ اختلاف رونما ہو گیا، کے سجن لال صاحب کا مضمون اس امر پر روشنی نہین ڈالتا،

مضمون مذکور میں کچھ طباعت اور ٹائپ کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں، اُن لوگوں کی آسانی کیلئے جو مضمون مذکور سے استفادہ کرنا چاہیں، ان غلطیوں کو ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے مضمون مذکور اسلامک کلچر کے صفحات ۲۰ سے ۴۴ تک میں شائع ہوا ہے؛ غلطیاں زیادہ فٹ نوٹوں میں ہیں، بعض غلطیاں اصل مضمون میں بھی ہیں، مگر کم، ذیل میں صفحہ وار غلطیاں درج کی جاتی ہیں،

(۱) ص ۲۰:- اصل مضمون کی سطر ۲ میں "سید حسین" تحریر ہے، جو غالباً "سید محمد حسین" ہونا چاہئے،

(۲) اسی صفحہ پر اصل مضمون کے ابتدائی حصہ میں اخبار کی تاریخوں اور نمبروں میں کچھ غلطی واقع ہو گئی ہے، ایک یہ کہ ۱۸۵۳ء کا نمبر ۲۴، ۱۲ر جون کو نکلا ہوگا، نہ کہ مئی ۱۸۵۳ء جیسا کہ مضمون میں تحریر ہے، دوسرے سیاق عبارت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امداد حسین ۳ر اگست ۱۸۵۳ء اور ۳ر اکتوبر ۱۸۵۳ء کی درمیانی کسی تاریخ کو دوبارہ طابع و ناشر ہوئے ہوں گے، جو تاریخ اس مضمون میں دی ہے، وہ بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتی،

(۳) ص ۲۲:- فٹ نوٹ نمبر ۱ میں جلد ۱۵ نمبر ۱۳ ۶ ۳ تاریخ ۱۷ر اپریل ۱۸۵۳ء تحریر ہے جو غلط ہے، نمبر ۱۶ ہونا چاہئے۔

(۴) ص ۲۶:- فٹ نوٹ نمبر ۲ میں جلد ۱۵ نمبر ۴۴ تاریخ ۲۹ر مئی ۱۸۵۳ء تحریر ہے غالباً نمبر ۲۲ کی جگہ نمبر ۴۴ غلط چھپ گیا ہے، کیونکہ تاریخ کے اعتبار سے ۲۹ر مئی ۱۸۵۳ء کو نمبر ۲۲ نکلا ہوگا، اور نمبر کے اعتبار سے نمبر ۴۴ کی تاریخ ۳۰ر اکتوبر ۱۸۵۳ء ہوتی ہے،

(۵) ص ۳۰:- فٹ نوٹ نمبر ۲ میں جلد ۱۴ نمبر ۵ کی تاریخ یکم فروری ۱۸۵۲ء دی ہے، اور صفحہ ۳۱ کے فٹ نوٹ نمبر ایک میں اس نمبر کی تاریخ ۸ر فروری ۱۸۵۲ء لکھی ہے، جلد ۱۴ نمبر ۵ کی صحیح تاریخ اول الذکر ہے، اور آخر الذکر تاریخ کا نمبر چھ ہے،

(۶) ص ۳۴:- فٹ نوٹ نمبر ایک میں جلد ۱۴ نمبر ۳۰ کی تاریخ ۱۲ر دسمبر غلط چھپ گئی ہے، ۲۰ر دسمبر ہونا چاہئے، اگر ۱۲ر دسمبر صحیح ہے، تو نمبر ۵۰ ہونا چاہئے،

(۷) ص ۳۹:- فٹ نوٹ نمبر ایک میں "جلد ۱۴ نمبر ۲ تاریخ ۱۱ر جون ۱۸۵۲ء" تحریر ہے، جلد ۱۴ نمبر ۲ کی تاریخ ۱۱ر جنوری ۱۸۵۲ء ہونا چاہئے، ۱۱ر جون غلط لکھا ہے، اُس دن سنیچر تھا، اخبار اتوار کو شائع ہوتا تھا،

(۸) فٹ نوٹ نمبر ۲ میں جلد ۱۴ نمبر ۵ تاریخ ۵ر فروری ۱۸۵۲ء تحریر ہے، ۵ر فروری کی جگہ یکم فروری ہونا چاہئے،

(۹) ص ۴۱:- فٹ نوٹ نمبر ایک میں جلد ۱۴ نمبر ۳۰ تاریخ ۱۲ر دسمبر ۱۸۵۳ء تحریر ہے، ۱۸۵۲ء کی جلد ۱۴ ہے، اور ۱۸۵۳ء کی جلد ۱۵- جلد ۱۴ کا ۳۰ واں نمبر ۱۲ر ستمبر ۱۸۵۲ء کو نکلا ہوگا، اس نمبر کا سنہ ص ۳۴ پر ۱۸۵۲ء صحیح دیا ہے،

(۱۰) ص ۴۲:- فٹ نوٹ نمبر ایک میں "جلد ۱۵ نمبر ۷" تحریر ہے، اور تاریخ نہیں دی ہے، اس نمبر کی تاریخ ۱۳ر فروری ۱۸۵۳ء ہونا چاہئے،

مذکورۂ بالا غلطیاں یہ فرض کرکے نکلتی ہیں کہ اخبار برابر ہر ہفتہ نکلتا رہا، امید ہے کہ کے سجن لال صاحب اصل پرچوں سے جو اُن کے پاس ہیں، مقابلہ کر لیں گے، اور اگر واقعی یہ غلطیاں ہیں، تو اُن کی صحت اسلامک کلچر میں کر دیں گے،

سفر حجاز

ادبیات

مسلک عرفان

از نواب جعفر علی خان اثر لکھنوی

تجھ سے روشن دل کا خلوت خانہ ہو — تو حقیقت ما سوا افسانہ ہے

ذات خود ہے تیرے ہونے کی دلیل — جس طرح منزل کا رہبر سنگ میل

بحرِ ہستی میں غضب کا جوش ہے — قطرہ قطرہ محشرِ خاموش ہے،

اس کی پہنائی کا پایان ہی نہین — کوئی پہنچے تہ تک، امکان ہی نہین

ہان مگر دانندہ ہین اسرار کے — توڑنے والے بتِ پندار کے

کھو گیا ایسا نہ پھر پایا گیا — عقل کو جس نے بنایا رہنما

جو بھی اپنے نفس کا بندہ ہوا — آنکھون والا ہوتے بھی اندھا ہوا

اک کسک تھی دل مین لب پر آہ آہ — قابلِ عبرت ہوا حالِ تباہ

یہ حقیقت ہے جہان کی یہ جہان — "پردہ اور پردے پہ کچھ پرچھائیان"

جزو و کل کا ربط ہو گیا آشکار — جب ہو نخوت جہل کی آئینہ دار

کوئی کیا ربانیت سے ہو دوچار — روح پر چھایا ہے غفلت کا غبار

آرزو مین ڈیرے ہین ڈالے ہوئے — آستینون سانپ ہین پالے ہوئے

نفس پر قابو جب انسان پائے گا — خواہشون کا سر بھی کچلا جائیگا

عشق جس دن بر سر کار آئے گا — رنگ دنیا اور کچھ ہو جائے گا

عشق کا شعلہ فروزان جب ہوا — خواہشون کے منہ کو لو کا دکھا دیا

نفس امارہ کی پھنکارین نہین — دفن اب سینے مین تلوارین نہین

دل کو حاصل تھا سکونِ جاودان — زندگی یکسر نشاط بیکران

گرم تھی اک محفلِ راز و نیاز — آنکھ روشن اور سینہ پُر گداز

علم و عرفان کی وہ نعمت ملگئی — عقل نے جس کا نہ دیکھا خواب بھی

عاشقانِ حق کے دل مین آگئے — جتنے بھی کونین کے اسرار تھے،

مدعائے آفرینش کھُل گیا — اتحادِ جزو کل آئینہ تھا،

عشق تھا نغمہ طرازِ زندگی — ہر طرف بجتا تھا سازِ زندگی

زندگی جب حق سے وابستہ ہوئی — بزمِ یکتائی کا گلدستہ ہوئی

آدمی جتنا سنبھلتا جائے گا، — چشمۂ وحدت اُبلتا جائے گا

وقت کا دھارا ہے اس کے واسطے — موجزن دریا ہے اس کے واسطے

مہر و مہ مینا بدوش اس کے لئے — وقف نغماتِ سروش اس کے لئے

کیون بدی سے ربط ہو آگاہ کو — نیکیان محبوب ہین اللہ کو،

ہے بدی نیکی کی ہے ایسی نمود — ہے اندھیرے کے اُجالے کا وجود

عشق کہتا ہے مرے ہمراز ہو — تاکہ خود اشیاء کی ضد غماز ہو

مین نے جو دیکھا ہے دیکھو تو کبھی — ہم بغل مجھ سے تو بڑھ کر ہو کبھی

مین جہان ہون کچھ نہین میرے سوا — ابتدا بھی مین ہون مین ہی انتہا

ہین مدارج مختلف عرفان کے — مستحق کو دیتے ہین پہچان کے

انبیا رو اولیا ہیں پیش پیش روح جتنی صاف اتنا نور بیش

راستے پر اُن کے چلنا چاہیئے رُخ نہ بھولے سے بدلنا چاہیئے

منزلیں ہوں کوچ ہو یا ہو مقام پیروی لازم ہے اُن کی لاکلام

رہبری کو عشقِ حق آگاہ ہو منزلِ سالک فقط اللہ ہو،

عشق جس کا جادہ ہو تھکتا نہیں وہ بھٹکتا یا بہک سکتا نہیں

کھینچتا ہے ذوقِ وجدانی اسے کیا کرے گی عقلِ زندانی اسے

حسنِ لافانی کا دیوانہ ہوا اُس کی تابانی کا پروانہ ہوا

بڑھتا ہے منزل بمنزل اُس طرف ہر قدم ہے اُس طرف دل اسطرف

حسن کی تابندگی بڑھتی گئی، عشق کی شوریدگی بڑھتی گئی

ماسوا سے جب فراغت ہوگئی ہر مصیبت وجہِ راحت ہوگئی

اب خودی خود آشنا ہونے لگی تابعِ حکمِ قضا ہونے لگی،

آئینہ تھا آئینے کے روبرو، آرزو تھی بے نیازِ آرزو

رحمتِ حق نور برسانے لگی خامشی پر بے خودی چھانے لگی

ہر نفس اک مژدہ تھا پیغام تھا مدعا بے کاہشِ انجام تھا،

طالب و مطلوب میں پردہ نہ تھا فرقِ حسن و عشق میں اصلا نہ تھا

قطرہ جب دریا سے واصل ہوگیا

رنجِ دوری وہم باطل ہوگیا

مطبوعات جدیدہ

یادگار فرحت مرتبہ جناب ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۱۸۸ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ؎ ، غیر مجلد للعہ، پتہ:۔ ڈاکٹر غلام یزدانی، باغ نارنج خیرت آباد، حیدر آباد دکن،

مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم اردو کے ممتاز اور صاحب طرز ادیب تھے جن کا انہی پر خاتمہ ہوگیا، دلی کے اس زمانہ کے تمام ادیبوں میں وہ نکھری ستھری اور شگفتہ و شاداب زبان لکھنے میں فرد تھے، ان کی تحریر زبان کے لطف و چاشنی کے باوجود دہلی پھلکی اور محاوروں کی بھرمار سے خالی ہوتی تھی، ان میں نہایت لطیف و خوشگوار فطری ظرافت تھی جو بغیر کسی اہتمام کے قلم سے برجستہ ٹپک پڑتی تھی، وہ ہنسنے ہنسانے والی باتیں نہیں لکھتے تھے، بلکہ لکھنے کا انداز ایسا تھا جس سے خود بخود تحریر میں شوخی و ظرافت جھلکنے لگتی تھی اور تحریر کی متانت کا پایہ بھی نہ گرنے پاتا تھا، یہ خصوصیت اردو کے کم مزاح نگاروں میں ہے، اس کی بہترین مثال ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی" ہے، ان کی دوسری خصوصیت قدیم تہذیب سے ان کا عشق تھا، وہ جدید تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود قدیم مشرقی تہذیب کے شیدائی خصوصاً دلی کی تہذیب کے پرستار و ماتم گسار تھے، ان کی تحریروں میں اس کے بڑے دلکش مرقعے ملتے ہیں، ان کے قلم کا دائرہ محض تفریحی ادب تک محدود نہیں تھا بلکہ سنجیدہ ادبی و تنقیدی مضامین بھی لکھتے تھے اس قسم کے مضامین میں انعام اللہ خان یقین، حکیم آغا جان عیش، خواجہ بدر الدین امان وغیرہ لائق ذکر ہیں، ایسے مضامین میں تنقید و تحقیق کی پوری شان ہوتی تھی، مرحوم کے مضامین کے کئی مجموعے ہیں مگر جن مضامین نے ان کا ادبی پایہ بلند کیا وہ "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور

کچھ میری زبانی، دلی کا قدیم مشاعرہ اور پھول والوں کی سیر ہے، یہ مضامین اردو ادب کے شاہکار ہیں، مرحوم کے احباب و مخلصین نے ان کی یادگار میں فرحت میموریل کمیٹی قائم کی ہے جو اردو کی سب سے بہتر تصنیف پر ہر سال پانسو روپیہ انعام دیا کرے گی، اس کمیٹی کی جانب سے مرحوم کے بچپن کے ساتھی اور عزیز ڈاکٹر غلام یزدانی نے مرحوم کے متعلق مضامین کا یہ مجموعہ مرتب کیا ہے، اس میں مرحوم کے سوانح، ذاتی حالات اور ان کے علمی و ادبی خدمات پر مختلف اصحاب قلم کے مضامین ہیں، ذاتی حالات ڈاکٹر غلام یزدانی، مرزا عصمت اللہ بیگ، مرزا رفیق بیگ اور مرزا حسین احمد بیگ کے قلم سے ہیں، ڈاکٹر غلام یزدانی مرحوم کے عمر بھر کے ساتھی ہیں اس لئے قدرۃً ان کا مضمون سب سے زیادہ جامع و مکمل ہے، مرزا رفیق بیگ کی تحریر میں جا بجا مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریر کی جھلک آگئی ہے، مرحوم کے علمی و ادبی کارناموں اور ان کی تحریری خصوصیات اور شاعری پر عزیز احمد صاحب، عبد القادر صاحب سروری، آغا محمد اشرف، الطاف گوہر، ڈاکٹر غلام محی الدین قادری زور اور خود ڈاکٹر غلام یزدانی نے تبصرہ کیا ہے آخر میں مرحوم کی وفات پر اخبارات و رسائل کے تاثرات نقل کئے ہیں اس طرح اس مجموعے میں مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کی زندگی کا پورا مرقع آگیا ہے جو امید ہے کہ اصحاب ذوق میں پسند کیا جائے گا،

پرنس آغا خان مرتبہ جناب محمد امین صاحب زبیری، تقطیع بڑی ضخامت ۲۹۰ صفحات کاغذ سپید ٹائپ خوبصورت، قیمت تحریر نہیں پتہ :۔ اسماعیلیہ ایسوسی ایشن حارث روڈ کھارادر کراچی ۲

سر آغا خان باعتبار اگرچہ اسمٰعیلی فرقہ کے پیشوا اور امام ہیں مگر بڑے وسیع القلب اور وسیع النظر ہیں انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں اتحاد و اتفاق کی کوشش کی اور بلا تفریق فرقہ و مسلک عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود ان کے پیش نظر رہی اور ضرورت کے اوقات میں نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے معاملات سے دلچسپی لیتے رہے، ہندوستان کے مسلمانوں کی خصوصیت

کے ساتھ انھوں نے بہت سی سیاسی و تعلیمی خدمات انجام دیں، مسلم یونیورسٹی کے قیام میں ان کا بڑا ہاتھ ہے گذشتہ نصف صدی میں ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست میں جتنے اہم اور نازک مواقع آئے ان میں سے اکثر مواقع پر سر آغا خان نے اپنے تدبر سے ان کی رہنمائی اور اپنے اثر و رسوخ سے ان کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی اس کتاب میں ان کے مختصر حالات و سوانح کے ساتھ ان کے عام قومی و ملی خدمات خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے اور ان کے گذشتہ سفر کراچی کے حالات مفصل بیان کئے گئے ہیں، جس سے ان کے خدمات کے ساتھ ان کے تدبر، سیاسی بصیرت، دوسرے اوصاف و خصوصیات، اور ان کی بین الاقوامی حیثیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے، کتاب میں صاحب سوانح کے متعلق بہت سی عکسی تصاویر ہیں،

المکالمۃ الاعظمیہ یا اردو عربی ترجمہ از جناب محمد حسن صاحب اعظمی ازہری، تقطیع اوسط ضخامت ۱۶۳ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عامر نیتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدر آباد دکن،

اردو میں عربی زبان کے قواعد اور املا و انشا پر اب بعض اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے ایک مذکورۂ بالا کتاب بھی ہے، مصنف ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں اور ان کو تعلیم کا بھی تجربہ ہے اس لئے انھون نے عربی زبان و ادب کی تعلیم کے جدید اصولوں کے مطابق یہ کتاب مرتب کی ہے اور عربی اردو دونوں ترجموں کے تدریجی اسباق اور ان کی مشقیں دی ہیں اور ہر سبق سے متعلق ضروری قواعد بھی تحریر کر دیے ہیں اس طرح اس کتاب سے قواعد اور دونوں زبانوں کے ترجموں کی تعلیم ساتھ ساتھ ہو جاتی ہے اس مقصد کے لئے یہ کتاب مفید ہے لیکن "الاعظمی ازہری" صاحب نے ہندیوں کی عربی دانی کے متعلق جو عام حکم لگا دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے اور اس سلسلہ میں انھون نے جو لطائف نقل کئے ہیں ممکن ہے وہ انہی کے ساتھ پیش آئے ہوں، معلوم نہیں عرب ادیب خود ان کی عربی کو کیا درجہ دیں گے اس کتاب سے تو ان کی امتیازی

عربی دانی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اس قسم کی کتابیں تو خالص ہندیوں نے بھی لکھی ہیں عربی کا صحیح مذاق پیدا کرنے کے لئے مصر کی ہوا کھانے کی نہیں بلکہ صحیح تعلیم کی ضرورت ہے، تعجب ہے کہ ازہری صاحب ہندوستان کے ان ادیبوں سے واقف نہیں ہیں جن کی تعلیم تمام تر ہندوستان میں ہوئی ہے مگر ان کی عربیت کا لوہا بڑے بڑے اہل زبان تک مانتے ہیں، بہرحال مصنف کی تعلی سے قطع نظر ان کی یہ کتاب عربی اور اردو ترجمہ کی مشق و مہارت کے لئے مفید ہے،

زندگی کا رخ از جناب سعید انصاری صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ،

تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عمار پتہ:۔ سنگم کتاب گھر دہلی

بچوں کے مستقبل اور ان کی آئندہ زندگی کی کامیابی کا دارومدار ان کی صحیح تعلیم و تربیت اور ان کے رجحان کے صحیح مصرف پر ہے مگر ان چیزوں کی جانب ہندوستانی گھروں میں بہت کم توجہ کیجاتی ہے، لائق مصنف نے جن کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا عملی تجربہ ہے اس اہم اور ضروری موضوع پر یہ کتاب لکھی ہے، اس میں انھوں نے زندگی کے پانچ اہم تعلیمی مسائل یا مراحل، بچوں پر گھر کا اثر، مدرسہ کی زندگی، بلوغ کے زمانہ، پیشہ کے انتخاب اور ازدواجی زندگی کے معاملات و مسائل پر تعلیمی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے اور ان کو حل کرنے کے اصول اور عملی طریقے بتائے ہیں جس سے زندگی کا صحیح رخ متعین ہو سکے اور بچوں کی صلاحیت صحیح راستہ پر لگ سکے اور وہ کامیاب زندگی بسر کرنیکے قابل بن سکیں یہ کتاب معلمین اور والدین کے مطالعہ کے لائق ہے،

مقالات یوم حالی شایع کردہ انجمن احیاے ادب پاکستان، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ:۔ انجمن احیاے ادب پاکستان، لاہور

مذکورہ بالا مقالات انجمن احیاے ادب پاکستان لاہور میں یوم حالی کے موقع پر پڑھے گئے تھے اس میں چار مقالات ہیں سیرت حالی جناب یحییٰ تنہا حالی اور اس کا مسدس حافظ جلیل احمد صاحب انصاری، مولانا الطاف حسین مرحوم کی پر خیر تحیہ اخوند اس حسن حالی کا پیغام صلاح الدین احمد صاحب ان میں حالی کی سیرت و اخلاق اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کا

جلد ۶۸ ماہ ذو قعدہ ۱۳۷۰ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۵۱ء عدد ۲

مضامین

مقالات

ادبیات

باب التقریظ والانتقاد